عرض احوال

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

پس چہ باید کرد؟

گزشتہ شمارے کے انہی صفحات میں پاکستان کے ساٹھ سالہ یوم آزادی کے حوالے سے ہم نے اس امر پر تشویش کا اظہار کیا تھا کہ اپنا غیر جانبدارانہ جائزہ لیں کہ آزادی کے ساٹھ سال کے بعد ہم کہاں کھڑے ہیں تو نہایت مایوس کن صورت حال نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں ہم نے ایک آزاد ملک کے لیے جس منزلِ مقصود اور ہدف کا تعین کیا تھا' حصولِ آزادی کے بعد اُس کی جانب پیش رفت نہیں کی جاسکی۔ ہم نے اِس معاملے میں بحیثیت قوم مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی پاکستان اسلامی فلاحی ریاست نہ بن سکا۔ اسلامی نظام کی منزل سے روگردانی اور اعراض کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قومی یکجہتی اور وحدت پارہ پارہ ہوچکی ہے۔ صوبائی تعصّبات' لسانی عصبیتوں اور فرقہ ورانہ اختلافات نے نفرتوں کے بیج بوکر قوم کو تقسیم کر دیا ہے۔ اور تو اور ہماری غلط پالیسیوں اور عاقبت نا اندیشانہ اقدامات کے نتیجہ میں بد قسمتی سے فوج اور عوام کے درمیان بھی نفرت کی خلیج حائل ہوگئی ہے' جو کہ نہایت ہی خطرناک ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ حکمران طبقے پر عائد ہوتی ہے۔ دوسری جانب ہم حقیقی آزادی سے محروم ہوگئے ہیں۔ ہمارے فیصلے امریکہ کر رہا ہے۔ اُسی کی ڈکٹیشن پر ملک چلایا جا رہا ہے۔ اُس کی مداخلت اِس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہی ہمارے آئندہ حکومتی سیٹ اپ کا خاکہ تیار کر رہا ہے۔ وہ اب من پسند نئے چہرے لانے کے لیے کوشاں ہے' تاکہ پاکستان میں امریکی مفادات کے تحفظ کو یقینی بنایا جاسکے' کیونکہ اُس کا خیال ہے کہ مشرف کے جانے کے بعد پاکستان کی ایٹمی تنصیبات ''دہشت گردوں'' کے ہاتھ آجائیں گی۔ اِن حالات میں اِس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ صدر مشرف اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو بچانے اور اقتدار کے تحفظ اور تسلسل کے لیے کوئی ایسا فیصلہ نہ کرلیں جو ملک وملت کے لیے تباہ کن ہو۔ یعنی اب وہ ہمارے لیے سیکیورٹی رسک بن چکے ہیں۔ ملک کو درپیش اِن خطرات سے واضح ہے کہ آج ہم نہایت خوفناک اور پر خطر حالات سے دوچار ہیں۔

مایوسی کے اِن گھٹاٹوپ اندھیروں میں امید کی واحد کرن عدلیہ کی آزادی کی صورت میں

نمودار ہوئی۔ عدلیہ کی آزادی اور فوجی آمر کا زوال بالکل غیر متوقع اور معجزانہ ہے۔ اِس میں کسی کا دخل نہیں ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہ اُن مظلوموں کی آہوں کا نتیجہ ہے جن کے جگر گوشے لاپتہ کر دیے گئے۔ ہماری خفیہ ایجنسیوں کے لوگ انہیں اُٹھا کر لے گئے اور اب کسی کو کوئی خبر نہیں کہ وہ کہاں ہیں' انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ یا پھر یہ اُن غریبوں اور ناداروں کی بد دعاؤں اور آہ وزاریوں کا نتیجہ ہے کہ جن پر غربت وافلاس کے سبب زندگی بوجھ بن چکی ہے' اور جو آئے روز خودکشیاں کر رہے ہیں۔ ظاہری طور پر اِس کا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے وکلاء کی تحریک کو بنا دیا ہے' جس کے نتیجے میں ''شخصی آمریت'' کو رسوا ہونا پڑ رہا ہے۔ جنرل (ر) حمید گل نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وکلاء سے ابابیلوں کا کام لیا ہے۔ بہرحال عدلیہ کی آزادی کا سبب جو بھی ہے' یہ حقیقت ہے کہ اِس سے امید کی کرن نمودار ہوئی اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید جبر کی یہ تاریک رات اپنے اختتام کو پہنچنے والی ہے۔

لیکن اصل سوال یہ ہے کہ کیا جنرل پرویز مشرف کی گرتی ہوئی ساکھ اور اقتدار واختیار سے ممکنہ بے دخلی سے صحیح معنوں میں قومی آزادی وخودمختاری کی بحالی' حقیقی عدل وانصاف اور امن و استحکام کے حصول اور پاکستان کے ایک اسلامی فلاحی ریاست بننے کی جانب سفر کا آغاز ہو جائے گا؟ کیا ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اِس سے جوہری طور پر ملک میں کوئی بڑی تبدیلی آ جائے گی؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اگرچہ بظاہر تبدیلی کی ہوا چل پڑی ہے' مگر اندیشہ ہے کہ ماضی کی طرح یہ تبدیلی بھی محض چہروں کی ہوگی' جابرانہ' ظالمانہ اور استحصالی نظام میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ بے نظیر اور نواز شریف دو دو بار سریر آرائے اقتدار ہو چکے ہیں' اُن کی کارکردگی کیا رہی؟ کیا اُن کے دور میں مہنگائی کم ہوئی؟ لاقانونیت کا خاتمہ ہوا؟ اسلام کے حوالے سے تبدیلیٔ نظام کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش ہوئی؟ کیا اُنہوں نے جمہوریت کے پردے میں شخصی آمریت کا سکہ نہیں جمایا؟ کیا انہوں نے پارلیمنٹ کو ربڑ سٹیمپ اور کابینہ کو کچن کیبنٹ میں تبدیل نہیں کیا؟ کیا اُن کے دور میں سیاسی مخالفین کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی گئی؟ اگر اُن کے نامۂ اعمال میں یہ سب کچھ موجود ہے' تو پھر کیونکر بڑی تبدیلی کی امید کی جا سکتی ہے؟ اِلّا یہ کہ انہوں نے حالات سے واقعی سبق سیکھا ہو' جن کا امکان بہت ہی کم ہے۔

ہماری وکلاء برادری کے لوگ اور لاپتہ افراد کے عزیز واقارب آج کل جنرل پرویز مشرف کے خلاف مظاہروں میں اُن سے امریکہ کی غلامی ترک کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ بہت مناسب اور معقول مطالبہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پرویز مشرف نے پوری قوم کو امریکہ کی غلامی کی

دلدل میں دھکیل دیا ہے اور اِس سے نجات از حد ضروری ہے' مگر جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ جب تک ہم خود اپنے انداز فکر' طرزِ زندگی اور معاملات میں مغربی غلامی کا رویہ ترک نہیں کریں گے' جب تک ہم خود ہر قسم کی غلامی سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کی غلامی میں اپنے آپ کو نہیں دیں گے' جب تک ہم طاغوتی ظالمانہ نظام سے چھٹکارا اور اللہ کے دیے گئے عادلانہ و منصفانہ نظام کے قیام کے لیے منظّم عوامی مزاحمتی تحریک نہیں چلائیں گے' تب تک ہمیں حقیقی آزادی نصیب نہ ہوگی' امریکی غلامی کا طوق ہمارے گلے سے کبھی نہ اُتر سکے گا۔ محض چہروں کے بدلنے سے ہمارے حالات نہیں بدلیں گے۔ بے نظیر بھٹو کی امریکہ کے ساتھ وفاداری تو ان کے ہر بیان کے ساتھ چھلکتی ہے' اُن سے تو کسی خیر کی توقع کی ہی نہیں جاسکتی' نواز شریف صاحب بھی' جن سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی گئی ہیں' اگر برسرِ اقتدار آ گئے تو وہ بھی کم و بیش اُسی استحصالی نظام کے علمبردار اور اُسی ظالمانہ خارجہ پالیسی پر کاربند ہوں گے جو پرویز مشرف چلا رہے ہیں۔ چند دن پہلے اُن کے دو بیانات اخبارات میں چھپے' جو ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونے چاہئیں۔ انہوں نے امریکی ٹی وی سی این این کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''ہم یقین کامل سے دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑیں گے۔ اگر قوم اور پارلیمنٹ ساتھ نہ ہو تو آپ دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں لڑ سکتے۔'' اِس کا مطلب واضح ہے۔ یعنی وہ امریکہ کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ اُس کی نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہم پرویز مشرف سے زیادہ معاون و مددگار ثابت ہوں گے' آپ ہمیں آزما کر دیکھ لیجیے' ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ اِسی طرح اپنے ''امریکی آقا'' کو خوش کرنے کے لیے انہوں نے یہ بیان بھی دیا ہے کہ ۱۹۹۷ء میں اکثریت کی بنا پر ہم نے چاہا تھا کہ شریعت نافذ کر دیں' مگر اب کی بار یہ ''غلطی'' نہیں کریں گے۔ اللہ کرے کہ ان کا یہ بیان غلط رپورٹ کیا گیا ہو' تاہم یہ بیانات واضح کرتے ہیں کہ چہروں کے تبدیل ہو جانے کے باوجود امریکہ کی غلامی برقرار رہے گی۔ امریکہ کی غلامی سے چھٹکارا اور حقیقی آزادی کے حصول کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم امریکہ کی طاقت کے سحر سے باہر نکل کر کائنات کی اصل طاقت اللہ تعالیٰ کا سہارا پکڑیں' اُس سے لو لگائیں' اُسے راضی کریں۔ اگر وہ ہم سے راضی ہو گیا اور اُس کی مدد و نصرت ہمیں حاصل ہو گئی تو پھر کوئی ہمارا بال بیکا نہ کر سکے گا۔ اللہ کی جانب رجوع اور اُس کے دین سے وفاداری انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی مطلوب ہے۔ یہی ہماری پناہ گاہ ہے' یہی عزت' تحفظ' بقا' سلامتی اور آزادی کا حقیقی راستہ ہے' ورنہ خاکم بدہن' رہی سہی آزادی بھی چھن سکتی ہے۔ ہمارے زوال اور نکبت کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم نے دین کو چھوڑ دیا ہے اور اللہ کو بھلا بیٹھے ہیں۔ حالانکہ ہمیں تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (الانفال)

”اور اگر ایمان رکھتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے حکم پر چلو۔“

ہماری عظیم اکثریت کا حال یہ ہے کہ زندگی کے تمام گوشوں میں اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت‘ اپنی معیشت‘ معاشرت اور سیاست میں اسلامی تعلیمات کی پیروی تو درکنار ارکان اسلام‘ نماز روزہ پر بھی کاربند نہیں۔ ہم نے بحیثیت قوم اللہ کے دین سے غداری کی ہے۔ افرادِ قوم نے اللہ تعالیٰ کی بجائے زمانے کے چلن اور رسم و رواج اور روپے پیسے کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ ہمیں اپنا یہ طرزِ زندگی تبدیل کرنا ہوگا اور اللہ کے ساتھ اپنا مضبوط تعلق استوار کرنا ہوگا۔ پھر یہ کہ اجتماعی سطح پر دین سے جو بے وفائی ہو رہی ہے‘ اُسے ترک کر کے نفاذِ اسلام کے لیے جدوجہد کرنا ہوگی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ سے غداری کریں‘ اُس کے احکامات سے انحراف کریں‘ اجتماعی سطح پر اُس کے دیے گئے نظامِ عدل سے متصادم نظام چلائیں‘ اور وہ ہمیں عزت و کامرانی عطا کرے! ایسے لوگوں کے بارے میں جو اُس کے دیے گئے قانون و شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں‘ اللہ کا دوٹوک فیصلہ ہے کہ وہ فاسق‘ ظالم اور کافر ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ہم نام کے مسلمان بننے کی بجائے عملی طور پر مسلمان بنیں۔ مسلمانی کے کچھ بنیادی تقاضے ہیں‘ جنہیں پورا کیا جانا لازم ہے۔

پہلا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم سب اللہ کی جناب میں سچی توبہ کریں۔ ہمارے حکمران بھی توبہ کریں اور ہمارے علماء‘ عوام اور سیاستدان بھی! اور پھر توبہ کے عملی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے غلط طرزِ زندگی اور باغیانہ روش کو ترک کریں‘ اپنی خطاؤں‘ کوتاہیوں اور جرائم سے کنارہ کش ہو کر اصلاحِ عمل پر کمربستہ ہو جائیں‘ اور آئندہ کے لیے ان سے اجتناب اور اللہ کی بندگی کا عزمِ مصمم کریں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ غفورٌ رحیم ہے‘ وہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہمارا مالک اور رب تبارک و تعالیٰ ہر رات کو جس وقت آخری تہائی رات باقی رہ جاتی ہے‘ سماءِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے: کوئی ہے جو مجھ سے دعا کرے اور میں اس کی دعا قبول کروں! کوئی ہے جو مجھ سے مانگے‘ میں اس کو عطا کروں! کوئی ہے جو مجھ سے مغفرت اور بخشش چاہے‘ میں اس کو بخش دوں!“ (متفق علیہ)

دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے دین کے معاون و مددگار بنیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ (الصّف:۱۴)

”اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ“۔

(باقی صفحہ 26 پر)

بقیہ: عرضِ احوال

اللہ تعالیٰ کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ اللہ کے مددگار بننے سے مراد اُس کے دین کا جھنڈا بلند کرنا‘ اُس کی نصرت‘ حمایت‘ اُس کے غلبے کی جدوجہد کرنا ہے‘ تاکہ دین اللہ غالب و سربلند ہو‘ ﴿لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ افسوس کہ ہم نے اسلامی نظام کے قیام سے روگردانی کی ہے اور یہ ہمارا اجتماعی جرم ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اِس جرم کا ازالہ کریں اور غلبہ دین حق کی جدوجہد کریں جو ہمارا بنیادی دینی فریضہ ہے۔ یہی قیام پاکستان کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بھی ہے۔ اِس کے لیے اپنے جسم و جان کی توانائیاں لگائیں‘ اپنے اوقات صرف کریں‘ اپنا مال خرچ کریں۔ اگر ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر دین کی پیروی کر کے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیں تو اُس کی نصرت ضرور ہمارے شامل حال ہوگی۔ وہ خود فرماتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ﴾ (محمد)

’’اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا۔‘‘

اور اگر اللہ ہمارا مددگار ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ﴾ (آل عمران: ۱۶۰)

’’اگر اللہ تمہارا مددگار رہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔‘‘

آج دنیا میں انسانوں کی عظیم اکثریت بشمول مسلمانوں کے اللہ کی بغاوت پر اتر آئی ہے۔ اُس نے طاغوتی تہذیب اور باغیانہ شیطانی نظام کو اپنا رکھا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ربّ کی دھرتی پر اُسی کا نظام چلے‘ اُسی کا قانون نافذ ہو۔ لیکن اللہ کی دھرتی پر آج انسانوں کا خود ساختہ ظالمانہ نظام چل رہا ہے۔ اللہ سے وفاداری کا تقاضا ہے کہ ہم اِس نظام کو ہٹا کر اللہ کی حاکمیت پر مبنی اسلامی نظام قائم کریں۔ مسلمانان پاکستان کی تو یہ دوہری ذمہ داری ہے‘ اس لیے کہ ہم نے نفاذِ اسلام کے وعدے پر یہ ملک حاصل کیا تھا۔ اسلام کے بغیر نہ تو ہماری بقا و سلامتی ممکن ہے اور نہ ہم حقیقی آزادی کی منزل سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رضا‘ اور طاغوتی نظام کے خاتمے اور اپنے سچے اور عادلانہ نظام کے غلبے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

شَھرٌ مُبارَکٌ

صیام و قیامِ رمضان
کی
اہمیت‘ فرضیت اور حکمت

جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی لاہور میں

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۷ ستمبر ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم —— بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾﴾ (البقرۃ)

الی قولہ تعالیٰ :

﴿شَہۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ ہُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡہُدٰی وَ الۡفُرۡقَانِ ۚ فَمَنۡ شَہِدَ مِنۡکُمُ الشَّہۡرَ فَلۡیَصُمۡہُ ؕ وَ مَنۡ کَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ ۫ وَ لِتُکۡمِلُوا الۡعِدَّۃَ وَ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ہَدٰىکُمۡ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾﴾ (البقرۃ) صدق اللّٰہ العظیم

حضرات! آج شعبانِ معظم کا آخری جمعہ ہے اور اگلا جمعہ لازماً رمضان مبارک میں ہو گا۔ اس مناسبت سے میں آج ''صیام و قیامِ رمضان کی اہمیت' فرضیت اور حکمت'' کو اجمالاً بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ نوٹ کیجیے کہ روزے کی عبادت مکی دَور میں موجود نہیں تھی' بلکہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل عرب میں روزے کا کوئی رواج غالباً تھا ہی نہیں۔ روزے کا آغاز ہجرتِ مدینہ کے بعد ہوا ہے۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے یہود کو دیکھا کہ وہ ''عاشورہ'' یعنی دسویں محرم کا روزہ رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ یہ روزہ کیوں رکھتے ہو؟ تو انہوں نے کہا اس لیے کہ یہ ہمارا یومِ نجات ہے' اس دن ہمیں فرعون سے نجات ملی تھی اور ہمیں اللہ نے بحفاظت سمندر پار کرا دیا تھا۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہم تم سے بڑھ کر حق دار ہیں! لہٰذا آپؐ نے مسلمانوں کو بھی حکم دے دیا کہ تم بھی یہ عبادت انجام دو' البتہ یہود سے فرق کرتے ہوئے نہ صرف دسویں محرم کا بلکہ نویں محرم کا روزہ بھی رکھو۔ کچھ عرصے کے بعد آپؐ نے ہر مہینے میں تین روزوں کا حکم دے دیا' یعنی چاند کی تیرہویں' چودھویں اور پندرہویں تاریخوں کے روزے۔ اور اس میں بھی **وجوب علی التخییر** کا معاملہ رکھا گیا' یعنی تمہیں اختیار ہے چاہو تو روزہ رکھ لو اور چاہو تو روزہ رکھنے کے بجائے فدیے کے طور پر ایک مسکین کو کھانا کھلا دو۔ قرآن مجید میں اس کے لیے ارشاد ہے: ﴿وَعَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ﴾ (البقرۃ:۱۸۴) ''اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) اُن کے ذمہ ایک مسکین کا کھانا ہے''۔ یہ **وجوب علی التخییر** ہے۔ البتہ اسی آیت میں یہ بھی فرمایا گیا: ﴿وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ ''اور روزہ رکھو تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو''۔ پھر مدینہ میں غالباً سولہ سترہ مہینے گزرنے کے بعد تحویلِ قبلہ کا معاملہ ہوا' اور قریب قریب اسی زمانے میں رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے' اور اب یہ **وجوب علی التعیین** تھا کہ اب پورے رمضان کے روزے لازماً رکھنے ہیں۔ پہلے ہر ماہ تین روزوں کے احکام میں جو ایک اختیار تھا کہ چاہو تو روزہ رکھ لو اور چاہو تو اس کا فدیہ ادا کر دو' اب وہ اختیار ختم ہو گیا۔ اب رمضان کے پورے مہینے کے روزے رکھنا' چاہے وہ ۲۹ دنوں کا ہو چاہے ۳۰ دنوں کا' اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرضِ عین ہے۔ البتہ ایک رعایت جو پہلے بھی تھی' وہ برقرار رکھی گئی کہ: ﴿وَمَنۡ کَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ﴾ ''اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو (ماہِ

رمضان کے علاوہ) دوسرے دنوں میں اس کی تعداد پوری کرنا ہے‘‘۔

لفظ ’’صَوْم‘‘ یا ’’صِیَام‘‘ کے معنی پر غور کیجیے۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ ’’صِیَام‘‘ صَوْم کی جمع ہے‘ جبکہ یہ درست نہیں ہے‘ بلکہ صَوْم اور صِیَام دراصل صَامَ یَصُوْمُ سے مصادر ہیں‘ جیسے قَامَ یَقُوْمُ سے قَوْمًا وَقِیَامًا مصدر ہیں جن کا مطلب ہے کھڑے ہونا۔ تو صِیَام مصدر ہے جس کا لفظی مطلب ہے کسی شے سے رک جانا‘ اور اس سے مراد ہے کھانے پینے سے رک جانا۔ عرب میں یہ لفظ پہلے کیسے مستعمل تھا‘ یہ بھی جان لیجیے۔ عرب اپنے گھوڑوں کو روزہ رکھواتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ و جدال اور غارت گری عربوں کا پیشہ تھا۔ وہاں امن تو تھا ہی نہیں‘ سوائے اشہرحرم کے‘ یعنی جو حج کے تین مہینے تھے ذوالقعدہ‘ ذوالحجہ اور محرم اور جو عمرے کا ایک مہینہ تھا رجب‘ بس ان میں امن ہوتا تھا۔ اب اس کام کے لیے ان کے پاس سواری کے لیے دو جانور تھے‘ اونٹ اور گھوڑا۔ اونٹ اگرچہ ذرا صابر قسم کا جانور ہے‘ پورا ایک ہفتہ بھی اسے اگر کچھ کھانے اور پینے کو نہ ملے تو اسے کوئی پروانہیں ہوتی۔ اس کے جسم میں اللہ نے اتنی توانائی محفوظ کی ہوئی ہے کہ وہ اس پر کئی کئی دن گزارہ کرسکتا ہے۔ اس اعتبار سے اُونٹ عربوں کے لیے بہت آسانی سے میسر تھا‘ لیکن اونٹ کی رفتار تیز نہیں ہے۔ جبکہ عربوں کا معمول یہ تھا کہ وہ چھاپہ مار جنگ کے انداز میں گئے‘ غارت گری کی اور واپس بھاگے۔ تو چونکہ تیز رفتاری کے ساتھ لوٹنا ضروری ہوتا تھا لہٰذا انہیں گھوڑا زیادہ پسند تھا۔ لیکن یہ نفیس الطبع حیوان ہے۔ یہ تیز تو دوڑ سکتا ہے لیکن بھوک اور پیاس برداشت نہیں کرسکتا۔ عرب اسے اس بھوک اور پیاس کا عادی بنانے کے لیے اس سے روزہ رکھواتے تھے۔ وہ اس طرح کہ اس کا چارہ اور پانی بند کردیتے تھے۔ مزید یہ کہ وہاں پر چونکہ سخت دھوپ پڑتی تھی اور گرم لو چلتی تھی تو وہ اپنے گھوڑوں کو اس کا عادی بنانے کے لیے اپنے منہ پر تو گرم لُو سے بچنے کے لیے پورا ڈھاٹا باندھ لیتے تھے‘ جبکہ گھوڑوں کا منہ سیدھا لُو کی طرف کردیتے تھے تاکہ لُو آئے‘ تھپیڑے مارے اور یہ اسے برداشت کریں‘ تاکہ ان میں برداشت کا مادہ پیدا ہو جائے۔ تو یہ ہے لفظ ’’صوم‘‘ یا ’’صیام‘‘ کا پس منظر۔ ایک بات اور نوٹ کر لیجیے‘ اس میں ایک بہت ہی لطیف نکتہ ہے۔ قرآن مجید میں صوم اور صیام کے احکامات سورۃ البقرۃ کے تیئیسویں رکوع میں ہیں اور چوبیسویں رکوع سے قتال کا حکم شروع ہو رہا ہے۔ گویا یہاں بھی وہی مناسبت ہے‘ اور یہ ترتیب اس بات کی طرف اشارہ کررہی ہے کہ جنگ کی سختیاں جھیلنے کے لیے اب تم بھی تیار ہو جاؤ جیسے تم اپنے گھوڑوں کو تیار کرتے تھے۔

احکامِ صوم کے ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے صلوٰۃ' حج اور زکوٰۃ کے احکام تو قرآن میں منتشر ملتے ہیں' جبکہ روزوں کے بارے میں ساری بحث قرآن میں یکجا ملتی ہے۔ نماز اور اس سے متعلقہ امور کا ذکر کسی ایک جگہ پر نہیں ہے' بلکہ مختلف مقامات پر ہے۔ مثلاً نماز کی حکمت کہ ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ﴾ کسی اور جگہ پر ہے' وضوو تیمّم کا ذکر کسی اور جگہ ہے' غسل کا حکم کسی اور جگہ پر ہے۔ ایسے ہی صلوٰۃ الخوف کا حکم کسی اور جگہ پر ہے۔ اسی طرح سے حج کا ذکر بھی قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر ہے۔ دیگر مقامات کے علاوہ سورۃ الحج کے چوتھے رکوع میں اور سورۃ البقرۃ کے چوبیسویں اور پچیسویں رکوع میں تفصیل سے موجود ہے۔ زکوٰۃ کے احکام اور تفصیل بھی کسی ایک جگہ پر نہیں ہے۔ لیکن روزے کی عبادت کے تمام مباحث سورۃ البقرۃ کے تیئیسویں رکوع میں' جو چھ آیات پر مشتمل ہے' مکمل ہو جاتے ہیں۔ اس میں اس کا ابتدائی حکم بھی ہے' ابتدائی حکمت بھی ہے' فرضیتِ صومِ رمضان کا بیان بھی ہے اور اس کے تکمیلی احکام بھی ہیں۔ اور خاص طور پر یہ کہ روزوں اور رمضان مبارک کو جمع کرنے کی کیا حکمت اور غرض وغایت ہے' اس کا بیان بھی اسی ایک جگہ پر ہے۔

حکمتِ صوم کی تین سطحیں

میری آج کی گفتگو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ صوم کی حکمت کیا ہے؟ اسے میں تین سطحوں (levels) پر بیان کر رہا ہوں۔ دیکھئے پانی کی ایک تو بالکل اوپر کی سطح ہوتی ہے جسے ''surface water'' کہتے ہیں۔ جیسے دریاؤں اور ندیوں کی صورت میں پانی ہمیں سطح زمین پر نظر آ رہا ہے۔ اور ایک ہوتی ہے پانی کی زیریں سطح (subsoil water)۔ یہ پانی محض ہینڈ پمپس کے ذریعے سے یا محض کنواں کھود کر بھی نکال لیا جاتا ہے۔ جبکہ پانی کی ایک سطح اس سے بھی بہت نیچے تقریباً تین سو یا چار سو فٹ کی گہرائی میں ہوتی ہے۔ یہ پانی ٹیوب ویلز کے ذریعے ہی نکالا جاتا ہے اور سب سے زیادہ صاف اور شفاف پانی یہی ہوتا ہے۔ اوپر کی سطح کے پانی میں آلودگی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ شہروں کا سارا گند اور آلودگی ندی نالوں کے ذریعے دریاؤں میں جا رہی ہے۔ اسی طرح زیریں سطح کے یعنی تقریباً چالیس پچاس یا ساٹھ ستر فٹ گہرے پانی میں بھی زمین کی اوپر کی غلاظتوں کے شامل ہو جانے کا امکان موجود ہے۔ البتہ جو تین سو چار سو فٹ نیچے کا پانی ہے وہ ان تمام غلاظتوں اور آلودگیوں سے مبرا ہے اور یہی پانی

لوگوں کو ٹیوب ویلز کے ذریعے پینے کے لیے مہیا کیا جاتا ہے۔اسی اعتبار سے روزے کی عبادت کی سب سے اوپر کی سطح پر ایک حکمت ہے۔اس کو اصطلاح میں ''ضبطِ نفس'' (self control) کہا گیا ہے۔اس پر لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔مولانا مودودی مرحوم کا بھی اس موضوع پر ایک بہت عمدہ مضمون ہے ''روزہ اور ضبطِ نفس''۔تو روزہ ایک تو ضبطِ نفس کی مشق ہے۔

انگریزی میں دو الفاظ معروف ہیں: self annihilation اور self control۔ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے جسے نوٹ کر لینا چاہیے۔ self control تو مطلوب ہے' تاکہ آپ اپنے نفس کے تقاضوں کو اپنے قابو میں رکھ سکیں' یہ نہ ہو کہ آپ اپنے نفس کے غلام ہو جائیں اور اس کا جو تقاضا بھی ابھرے اسے پورا کرنے کے لیے حاضر ہو جائیں' بغیر یہ دیکھے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز' حلال ہے یا حرام۔ جبکہ self annihilation سے مراد ہے نفس کو کچل دینا' اس کے تقاضے بالکل مار دینا۔یہ رہبانیت کا طریقہ ہے۔ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ (الحدید:۲۷) ''اور رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کر لی' ہم نے اُن پر وہ فرض نہیں کی تھی''۔اسلام رہبانیت کا شدید مخالف ہے۔جیسے احادیث میں آتا ہے کہ تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں سے آپؐ کی نفلی عبادات کے بارے میں دریافت کیا۔جب انہیں بتایا گیا تو انہوں نے اسے اپنے تئیں کم سمجھا اور کہنے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو بہت زیادہ عبادت و ریاضت کی ضرورت نہیں ہے' جبکہ ہمیں اس کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں تو رات بھر نماز پڑھوں گا' سوؤں گا نہیں۔دوسرے نے کہا کہ میں تو روزانہ روزہ رکھوں گا' کبھی ناغہ نہیں کروں گا' جبکہ تیسرے نے طے کیا کہ میں عورتوں سے دور رہوں گا' لہٰذا ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعے کی خبر پہنچی تو آپؐ نے اس کا سختی سے نوٹس لیا اور اُن حضرات کو بلا کر فرمایا کہ کیا تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ یہ باتیں کہی ہیں؟ پھر آپؐ نے یہ غیر معمولی الفاظ ارشاد فرمائے:

((اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ ' لٰكِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ' فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَيْسَ مِنِّیْ)) (۱)

''اللہ کی قسم! میں تم میں سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں۔لیکن میری سنت یہ ہے کہ میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' میں (نفلی) نماز پڑھتا بھی ہوں اور رات کو سوتا بھی ہوں اور میں نے

شادیاں بھی کی ہیں۔ پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

تاریخ انسانی میں اس نفس کشی (self annihilation) کے معاملے میں سرفہرست تو عیسائی راہب ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رہبانیت کے آغاز میں بہت سے لوگوں نے واقعتاً نفس کو کچلنے کا حق ادا کیا۔ لیکن بعد میں اس کے اندر دکھاوا آ گیا کہ بظاہر تو راہب ہیں لیکن اندر خانے سب بدمعاشیاں ہو رہی ہیں۔ راہب خانوں میں بظاہر تو راہب اور راہبائیں رہتی ہیں لیکن ان کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں اور حرامی بچوں کی پیدائش ہو رہی ہے۔ دراصل نفس کو اس طریقے سے آسانی سے نہیں پچھاڑا جا سکتا' بلکہ نفس انسان کو پچھاڑ دیتا ہے۔ ایسے لوگ شاذ ہوتے ہیں جو اتنی سخت پابندیاں اپنے اوپر لگا لیں اور پھر انہیں نباہ بھی سکیں۔ چنانچہ پہلی سطح پر روزے کی حکمت ہے ''ضبطِ نفس'' (self control)۔

اب ذرا نیچے اتر کر دیکھیے کہ اس نفس کو کنٹرول کرنے والا کون ہے' یعنی subsoil water (زیر سطح) کیا ہے۔ نفس اصل میں حیوانی تقاضوں (animal instincts) کا نام ہے۔ سارے حیوانی تقاضے ہمارے اندر بھی موجود ہیں۔ گویا ہمارے اندر ایک مکمل حیوان موجود ہے۔ چنانچہ جیسے تمام حیوانات کو خوراک چاہیے' ایسے ہمیں بھی چاہیے۔ تمام حیوانات میں بقائے نسل کے لیے جنسی جذبہ رکھا گیا ہے تو وہ ہمارے اندر بھی ہے۔ جیسے تمام حیوانات کو کچھ آرام چاہیے ایسے ہمیں بھی چاہیے۔ اور ہمارے اندر یہ حیوانی تقاضے افراط و تفریط کا شکار بھی ہو جاتے ہیں' ان میں بے اعتدالی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات کسی شخص میں شہوت کا جذبہ اتنا ہو جاتا ہے کہ اس کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے' جبکہ بہت سے لوگوں میں قابل گرفت ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں میں حبّ مال کا جذبہ غالب ہوتا ہے اور وہ مال سمیٹنے میں ہی لگے ہوتے ہیں' اُن میں شہوت کا جذبہ زیادہ نہیں ہوتا۔ تو اس حوالے سے دیکھا جائے تو نفس حیوانی تقاضوں سے عبارت ہے۔ اس کے لیے جدید سائیکالوجی میں ''id'' یا ''libido'' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں' جو اصل میں فرائیڈ کی اصطلاحات ہیں۔ اب یہ حیوانی تقاضے یا بالفاظِ دیگر جبلی تقاضے ایک طرف تو اندھے بہرے ہیں' انہیں حلال و حرام یا جائز و ناجائز سے کوئی غرض نہیں ہے۔ پیٹ میں بھوک کی جو آگ لگی ہوئی ہے وہ بجھنی چاہیے' چاہے حلال سے بجھے چاہے حرام سے۔ ایسے ہی شہوت کو بس اپنی تسکین چاہیے' اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کوئی جائز ذرائع سے شہوت پوری کر رہا ہے یا ناجائز راستے سے۔ اسے انگریزی میں sexual

gratification کہتے ہیں‘ یعنی نفسانی تقاضوں کو پورا کرنا۔ اب اس نفس کو کنٹرول کرنے والی شے انسان کی خودی‘ انا یا بالفاظِ دیگر انسان کی ”مَیں“ ہے۔ یہ ایک ہی چیز کے مختلف نام اور مختلف الفاظ ہیں۔ فرائیڈ کی اصطلاح میں اسے ”ego“ کہتے ہیں۔

اب خودی اور نفس کے مابین تعلق کو ایک مثال کے ذریعے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ فرض کیجیے ایک گھڑ سوار ہے اور ایک گھوڑا ہے۔ اگر گھڑ سوار طاقتور ہے تو وہ گھوڑے کو اپنے کنٹرول میں رکھے گا اور گھوڑا اسے وہیں لے جائے گا جدھر گھڑ سوار جانا چاہے گا۔ لیکن اگر سوار کمزور ہے اور گھوڑا منہ زور ہے تو گھوڑا جدھر چاہے گا جائے گا اور جہاں چاہے گا اپنے سوار کو پٹخ دے گا۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ نفس کی اس سواری پر اس طور سے سوار ہو کہ یہ نفس اس کے کنٹرول میں رہے‘ اس کی خودی اسے اپنے قابو میں رکھے۔

اب اس سے اور نیچے آیئے۔ جس شے کو خودی‘ انا‘ مَیں یا فرائیڈ کی اصطلاح میں ego کہتے ہیں‘ قرآن مجید کی اصطلاح میں اسے ”روح“ کہا گیا ہے۔ قصۂ آدم وابلیس کے ضمن میں قرآن میں آتا ہے:

﴿فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِیۡنَ۝﴾

(الحجر:۲۹‘ صٓ:۷۲)

”پس جب میں اسے (آدمؑ کو) پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا“۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَحَدَکُمۡ یُجۡمَعُ خَلۡقُهٗ فِیۡ بَطۡنِ اُمِّهٖ اَرۡبَعِیۡنَ یَوۡمًا‘ ثُمَّ یَکُوۡنُ فِیۡ ذٰلِکَ عَلَقَةً مِثۡلَ ذٰلِکَ‘ ثُمَّ یَکُوۡنُ فِیۡ ذٰلِکَ مُضۡغَةً مِثۡلَ ذٰلِکَ‘ ثُمَّ یُرۡسَلُ الۡمَلَکُ فَیَنۡفُخُ فِیۡهِ الرُّوۡحَ‘ وَیُؤۡمَرُ بِاَرۡبَعِ کَلِمَاتٍ‘ بِکَتۡبِ رِزۡقِهٖ وَاَجَلِهٖ وَعَمَلِهٖ وَشَقِیٌّ اَوۡ سَعِیۡدٌ……)) (۲)

”تم میں سے ہر ایک کی تخلیق یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنی والدہ کے پیٹ میں چالیس یوم تک (نطفہ کی صورت میں) رہتا ہے‘ اس کے بعد اتنے ہی روز تک علقہ کی صورت میں اور اس کے بعد اتنے ہی روز تک گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے۔ بعد ازاں اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو آکر اس میں رُوح پھونکتا ہے اور اسے اس پیدا ہونے والے کے متعلق چار باتیں رزق‘ عمر‘ عمل اور اس کے شقی (بدبخت) یا سعید

(نیک بخت) ہونے کے متعلق لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے......"

یعنی رحم مادر میں ایک سو بیس دن گزرنے کے بعد فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے۔ واضح رہے کہ روح سے مراد جان نہیں ہے' اس لیے کہ جان تو پہلے بھی تھی ۔ باپ کی طرف سے جو جرثومہ (spermatozoon) آتا ہے وہ بھی جاندار ہے' حرکت میں ہوتا ہے۔ اگر اسے مائیکروسکوپ کے اندر دیکھا جائے تو وہ بہت تیزی سے دوڑ رہا ہوتا ہے۔ اور ماں کی طرف سے جو جرثومہ آتا ہے وہ بھی جاندار عضویہ (living organism) ہے ۔ تو روح اور شے ہے' جان اور شے ہے۔ یہ دراصل روح ہے جو نفس کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔

فرائیڈ نے اپنی ذہانت اور مشاہدے سے انسان کی باطنی شخصیت کے تین levels کی نشاندہی کی ہے۔ سب سے نیچے id اور libido' اس کے اوپر ego اور اس کے اوپر super ego ۔ اگرچہ اس نے اس کی جو تعبیر کی ہے وہ غلط ہے۔ ہماری اصطلاح میں انسان کی باطنی شخصیت کے تین درجے (levels) نفس یا نفسِ امارہ' قلب اور روح ہیں۔ اصل میں روح کا تقاضا ہے کہ وہ وجود کو اپنے لیے استعمال کرے۔ ایسا نہ ہو کہ نفس کی ظلمانیت اور تاریکی روح کی نورانیت کے اوپر غالب آ جائے' اور یہی ہے روزے کی اصل حکمت۔

روح کا ذاتِ خداوندی کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے "رُوْحِیْ" (میری روح) کہا ہے۔ جیسے سورج کی کرن سورج سے چلتی ہے اور یہاں تک آ جاتی ہے' لیکن سورج سے اس کا تعلق منقطع نہیں ہوتا' اسی طرح روح کا تعلق ذاتِ باری تعالیٰ سے منقطع نہیں ہے' اگرچہ یہ انسان کے وجود میں آ گئی ہے۔ اس حوالے سے گویا روح انسان کے اندر وجودِ باری تعالیٰ کا ایک مظہر ہے ۔ رسول اللہ ﷺ سے مروی ایک حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ لَهُ اِلَّا الصِّيَامَ ' فَاِنَّهُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ))(۳)

"بنی آدم کے تمام اعمال اسی کے لیے ہیں سوائے روزہ رکھنے کے' پس یہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔"

یہ حدیث دراصل اس آخری درجے کے اعتبار سے ہے اور بدقسمتی سے یہ لیول ہماری' بلکہ علماء کی نگاہوں سے بھی اوجھل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کے مضامین اور خطابات میں اس

حدیث کا ذکر بہت کم ہوتا ہے۔

ماہِ رمضان ہی ماہِ صیام کیوں؟

اب میں جس بات پر بہت زیادہ زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ روزوں کے لیے رمضانِ مبارک کا مہینہ کیوں منتخب کیا گیا۔ یہ اس لیے کہ یہ نزولِ قرآن مجید کا مہینہ ہے اور صیام اور قرآن میں ایک خاص رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اس حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا خطبۂ مبارک ملاحظہ فرمائیے جو آپؐ نے شعبانِ معظم کے آخری دن ارشاد فرمایا تھا۔

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ ؓ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِیْ آخِرِ یَوْمٍ مِّنْ شَعْبَانَ فَقَالَ : ((یَا اَیُّهَا النَّاسُ فَقَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِیْمٌ، شَهْرٌ مُبَارَكٌ، شَهْرٌ فِیْهِ لَیْلَةٌ خَیْرٌ مِنْ اَلْفِ شَهْرٍ، جَعَلَ اللّٰهُ صِیَامَهٗ فَرِیْضَةً وَقِیَامَ لَیْلِهٖ تَطَوُّعًا......اِلٰی قَوْلِهٖ ﷺ: وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَّاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَّآخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ، وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَّمْلُوْكِهٖ فِیْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَاَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ))

حضرت سلمان فارسی ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں شعبان کے آخری دن خطبہ ارشاد فرمایا کہ: ''اے لوگو! تم پر ایک عظمت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے۔ یہ مہینہ بڑا بابرکت ہے۔ اس (مبارک) مہینے میں ایک رات (شب قدر) ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں قیام کرنے (یعنی تراویح) کو نفل قرار دیا ہے...... (اس خطبے کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا:) اور اس مبارک مہینے کا ابتدائی حصہ رحمت ہے، درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آتشِ دوزخ سے آزادی ہے۔ اور جو کوئی اس مہینے میں اپنے غلام و خادم اور زیردست کی مشقت میں تخفیف اور کمی کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اسے آتش دوزخ سے آزادی عطا فرمائے گا''۔

اس خطبہ میں نبی اکرم ﷺ ارشاد فرما رہے ہیں کہ ''تم پر ایک عظمت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے''۔ یعنی ابھی آیا نہیں ہے لیکن اس کے سائے پڑنے شروع ہو گئے ہیں۔ جیسے انگریزی میں کہا جاتا ہے:

"Coming events cast their shadows before."

''آنے والے واقعات کا ایک عکس پہلے سے پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔''

آپؐ فرما رہے ہیں کہ ''اس میں ایک رات وہ بھی ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے''۔ یعنی لیلۃ القدر۔ یہاں نوٹ کر لیجیے کہ اس رات کی افضلیت کی بنیاد بھی یہی ہے کہ: ﴿اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱﴾ (القدر) ''ہم نے اس (قرآن) کو قدر کی رات میں نازل فرمایا''۔ اور رمضان کی فضیلت کی بنیاد بھی یہی ہے کہ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵) ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''۔ ورنہ اللہ کے باقی تمام مہینے برابر ہیں' سب اللہ نے پیدا کیے ہیں۔ کسی بھی چیز کی فضیلت کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہوتی ہے اور ماہِ رمضان کی فضیلت کی بنیاد یہی نزولِ قرآن ہے۔ اور ایسے ہی لیلۃ القدر کی فضیلت کی بنیاد بھی یہی ہے کہ یہ نزولِ قرآن کی رات ہے۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر اس رات نزولِ قرآن کا آغاز ہوا تھا' اور دوسرا مفہوم یہ کہ آپؐ کی زندگی میں ایک خاص سال میں جو لیلۃ القدر آئی تھی اس میں پورا قرآن لوحِ محفوظ سے سمائے دنیا تک نازل کر دیا گیا تھا' پھر وہاں سے تھوڑا تھوڑا' حسب ضرورت حالات کے مطابق آپ ﷺ پر ۲۳ برس میں نازل ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کے اگلے الفاظ ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کا روزہ رکھنا تو فرض کیا ہے البتہ اس کی رات میں کھڑے رہنے کو مرضی پر چھوڑ دیا ہے (نفل قرار دیا ہے)''۔ قرآن میں اس قیام اللیل کا ذکر نہیں آیا تو اس کی یہی حکمت ہے کہ یہ فرض نہیں ہے۔ قرآن میں اگر اس کا ذکر آتا تو یہ فرض ہو جاتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک رمضان المبارک میں قیام اللیل کے طور پر تین راتیں تہجد کے وقت نماز کرائی۔ اب چوتھی رات بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انتظار کرتے رہے مگر آپؐ تشریف نہ لائے۔ صحابہ کھنکھارتے بھی رہے کہ شاید آپؐ کی آنکھ لگ گئی ہے۔ اگلی صبح آپؐ نے بتایا کہ میں جان بوجھ کر نہیں آیا' میں اگر یہ نماز متواتر تمہیں پڑھاتا تو یہ فرض ہو جاتی۔ یہ آپؐ کی رحمت و رأفت ہے اور آپؐ نے اس بات کو دیکھتے ہوئے ایسا کیا کہ اُمت میں کمزور لوگ بھی ہیں۔ وہ غریب آدمی بھی ہوگا جو شدید گرمی اور حبس میں صبح سے لے کر شام تک اینٹیں گارا ڈھوئے گا' کسّی چلائے گا' فصل کاٹے گا یا کوئی اور سخت محنت کرے گا' تو وہ اگر روزہ ہی رکھ لے تو بہت غنیمت ہے۔ رات کو جاگنا اس کے لیے کیسے ممکن ہوگا! لہٰذا روزے کے ساتھ قیام

اللیل کوفرض نہیں کیا گیا۔اور قرآن میں چونکہ اس قیام اللیل کا حکم نہیں ہے تو اس کی کھود کرید نہیں کرنی چاہیے۔ جو چیزیں قرآن نے چھوڑ دی ہیں تو وہ کسی حکمت کے تحت چھوڑی ہیں۔ جیسے قرآن مجید کے اوّل مخاطبین کو فرمایا گیا تھا کہ اللہ نے کچھ چیزوں کو حرام کیا اور کچھ کو حلال' جبکہ کچھ چیزوں کی طرف سے سکوت اختیار کیا' تو تم اس میں کھود کرید نہ کرو' مبادا وہ چیز ظاہر کردی جائے اور تم پر فرض ہو جائے۔ جیسے ایک شخص حج کی فرضیت کا حکم آنے پر کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرنے لگا کہ حضور! کیا ہر سال حج فرض ہے؟ آپؐ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا اور دوسری طرف رُخ کر لیا۔ وہ شخص دوسری طرف ہو کر پوچھنے لگا کہ حضور! کیا ہر سال فرض ہے؟ آپؐ نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔ تیسری مرتبہ پھر اس نے سوال کیا تو آپؐ نے ڈانٹ دیا اور فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دوں تو یہ ہر سال فرض ہو جائے گا۔ تو جس معاملے کے اندر اللہ نے اور اس کے رسول ﷺ نے سکوت فرمایا ہو اُس میں سکوت ہی صحیح ہے۔

رمضان مبارک کا دوگونہ پروگرام

اب دیکھئے رمضان میں قیام اللیل کے بارے میں اللہ کا حکم تو نہیں آیا البتہ رسول اللہ ﷺ اس چیز کو واضح فرما رہے ہیں کہ درحقیقت یہ دو عبادتیں ہیں' ایک نہیں ہے۔ آج ہم سمجھتے ہیں کہ صرف ایک روزہ ہی ہے۔ نہیں' بلکہ یہ دوگونہ پروگرام ہے کہ دن کو روزہ رکھو اور رات کو قرآن کے ساتھ کھڑے رہو' تاکہ ہر سال قرآن کے ساتھ تمہارا ایک تعلق تازہ ہو جائے۔ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ اس لیے آتا ہے تاکہ تمہارا ذہنی اور قلبی رشتہ قرآن کے ساتھ از سرِ نو تازہ ہو جائے۔

اب اس قیام اللیل کے بارے میں دو حدیثیں ملاحظہ فرما لیجیے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْآنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ : اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ' وَیَقُوْلُ الْقُرْآنُ : مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ' فَیُشَفَّعَانِ)) (۵)

''روزہ اور قرآن دونوں قیامت کے دن بندے کے حق میں (اللہ کے ہاں) شفاعت

کریں گے۔ روزہ کہے گا: پروردگار! میں نے تیرے اس بندے کو دن بھر کھانے پینے سے اور قضائے شہوت سے روکے رکھا (یہ میری وجہ سے رُکا رہا)' پس تو میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا: اے اللہ! میں نے تیرے اس بندے کو رات کے وقت سونے سے روکے رکھا (یہ میری وجہ سے رات کو جاگتا رہا)' پس تو میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما۔ پس دونوں (روزے اور قرآن) کی سفارش (اس بندے کے حق میں) قبول فرمائی جائے گی (اور اُس کے لیے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا)''۔

اس حدیث سے جو بات سمجھنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ صیام اور قیام دونوں متوازی اور ہم وزن ہیں۔ جیسے دن کا صیام جزوی نہیں ہوتا' بلکہ پورے دن کا ہوتا ہے' تو کیا رات کو صرف ایک گھنٹہ تراویح پڑھ لی جائے تو قیام اللیل کا حق ادا ہو جائے گا؟ اور اس لفظ کا اطلاق صحیح ہوگا؟

دوسری حدیث ملاحظہ فرمائیے! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ' وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ' وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ))(٦)

''جس نے روزہ رکھا رمضانِ مبارک میں ایمان کے ساتھ اور اللہ سے اجر کی امید میں اس کے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اور جو کھڑا رہا رمضان کے دوران ایمان کے ساتھ اور اللہ سے اجر کی امید میں اس کے بھی پچھلے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے اور جس نے قیام کیا قدر کی رات میں ایمان کے ساتھ اور اللہ سے اجر کی امید میں اس کے بھی پہلے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔''

ان دونوں حدیثوں کا حاصل یہ ہے کہ صیام اور قیام دونوں متوازی ہیں۔ قیام کا اطلاق کم سے کم کتنے وقت پر ہوگا' اس کا فیصلہ خود قرآن نے کر دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:
﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ﴿۲﴾﴾ (المزمل) ''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے! کھڑے رہا کرو رات کو سوائے تھوڑے سے حصے کے''۔ آگے اس کی وضاحت فرما دی:
﴿نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ﴾ ''آدھی رات یا اس میں سے کچھ کم کر لو (نصف میں سے کچھ کم ہوگا تو ایک تہائی رات رہ جائے گی) یا نصف پر کچھ زیادہ کر دو (یہ دو

تہائی رات ہو جائے گی)''۔ ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا﴾ ''اور قرآن کو پڑھو ٹھہر ٹھہر کر''۔ یہ جو کھڑے رہنا ہے یہ اس لیے ہے کہ قرآن مجید کو آہستہ آہستہ' سمجھتے ہوئے' غور کرتے ہوئے اور اپنے قلب و ذہن کو اس سے منور کرتے ہوئے پڑھنا ہے۔ میں نے جو یہ تعبیر کی ہے کہ اگر نصف سے کم ہو تو ایک تہائی رات اور اگر نصف سے زیادہ ہو تو دو تہائی رات بنتی ہے' تو یہ اسی سورۂ مبارکہ کے اخیر میں ہے کہ: ﴿اِنَّ رَبَّکَ یَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ﴾ (آیت ۲۰) ''(اے نبی!) آپ کا ربّ خوب واقف ہے کہ آپ بھی اور آپ کے کچھ ساتھی بھی کھڑے رہتے ہیں آپ کے ساتھ کبھی دو تہائی رات' کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات''۔ چنانچہ قیام اللیل کا اطلاق کم سے کم ایک تہائی شب پر ہو گا' اس سے کم پر نہیں۔

اب دیکھئے اس بات کی تشریح و توضیح کہ رات کا کم سے کم کتنا حصہ قیام اللیل میں گزارنا ہے۔ اس کی حکمت یہی ہے کہ اُمت پر سختی نہ ہو۔ اُمت میں سب لوگوں کے لیے ایسا ممکن نہیں ہو گا کہ رات بھر یا رات کا دو تہائی حصہ قیام اللیل میں گزاریں۔ نبی اکرم ﷺ نے قیام اللیل کی تشویق فرمائی' ترغیب دلائی اور قرآن میں جو حکم وضاحت سے نہیں آیا تھا اس کو واضح کر دیا' لیکن اسے اُمت پر فرض آپؐ نے بھی نہیں کیا۔ لہٰذا آپ نے رمضان مبارک میں تراویح کی باجماعت نماز کا اہتمام نہیں کیا سوائے تین راتوں کے اور وہ بھی پچھلی شب' تہجد کے وقت۔ بس ترغیب و تشویق تھی کہ کھڑے رہا کرو' قرآن کو ترتیل کے ساتھ پڑھو' کم سے کم تہائی شب تو کھڑے رہو۔ تب اس کا کم سے کم حق ادا ہو گا' اور اللہ توفیق دے تو نصف شب' اور اس سے بھی آگے بڑھ کر توفیق ہو تو دو تہائی شب۔ چنانچہ ترغیب و تشویق ہے' حکم نہیں ہے۔

بیس تراویح کا اجراء

جہاں تک تراویح کی نماز باجماعت کا تعلق ہے یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی نہیں تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ لوگ مسجد نبویؐ میں ٹولیوں کی صورت میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک حافظ کے ساتھ چار پانچ مقتدی ہوتے تھے جو قرآن سن رہے ہوتے تھے۔ ایسے میں ایک شب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے اور آپؓ نے دیکھا کہ لوگ اس طرح سے ٹولیوں میں قیام اللیل کے لیے کوشش کر رہے ہیں تو آپؓ نے کہا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ ان سب کو ایک امام کے پیچھے جمع کر دیا جائے۔ چنانچہ آپؓ نے یہ طے کر دیا کہ بیس رکعت تراویح سب مل کر

ایک امام کے پیچھے ادا کریں' اور یہ نمازِ عشاء کے متصل بعد ہو۔ اس لیے کہ تہجد کے وقت ایسا اہتمام ایک مشکل اور بھاری شے ہے۔ تہجد کی نماز اور اس میں قرآن کا پڑھنا رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص تھا' اُمت کے لیے یہ لازم نہیں ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمِنَ الَّیۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّکَ﴾ (بنی اسراءیل: ۷۹) ''اور رات کے کچھ حصے میں آپ اس قرآن کے ساتھ جاگتے رہیئے' یہ اضافہ ہے آپ کے لیے''۔ جس حکمت خداوندی کے طور پر قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے اسی حکمت کا ظہور ہو رہا ہے سنت نبویؐ میں کہ آپ ﷺ نے اس کو فرض ہونے سے بچایا ہے۔ لیکن یہ بیس رکعت تراویح جو ہم ایک گھنٹے سے بھی کم میں پڑھ لیتے ہیں اس سے قیام اللیل کا تقاضا ہرگز پورا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا' بیس رکعت باجماعت تراویح کا فیصلہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ آپؓ ایک دفعہ پھر مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے اور دیکھا کہ لوگ جماعت کی شکل میں ایک امام کے پیچھے تراویح پڑھ رہے ہیں' تو آپؓ نے فرمایا: نِعۡمَ الۡبِدۡعَةُ هٰذِهٖ [۷] ''یہ کیا ہی اچھی بات ہے جس کا ہم نے آغاز کیا ہے!''۔ یہاں بدعت سے مراد وہ بدعت نہیں ہے جس کی دین میں گنجائش نہیں ہے' بلکہ یہ ایک خلیفۂ راشد کا اجتہاد ہے' اور خلفائے راشدین کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((عَلَیۡکُمۡ بِسُنَّتِیۡ وَسُنَّةِ الۡخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیۡنَ الۡمَهۡدِیِّیۡنَ)) [۸]

''تم پر لازم ہے میرا طریقہ اور خلفائے راشدین مہدیین کا طریقہ''۔

تو یہ سنت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہے۔ اہل سنت کے چاروں مکاتبِ فقہ میں سے اکثر کے ہاں بیس تراویح ہیں۔ اہل حدیث حضرات آٹھ کے قائل ہیں۔ میں اس معاملے میں ان حضرات سے معذرت کے ساتھ سخت اختلاف کرتا ہوں۔ مجھے اِن کی بہت سی چیزیں پسند ہیں' لیکن اس معاملے میں ان کی دلیل غلط ہے۔ ان سے گزارش ہے کہ اگر تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کو چھوڑ کر نبی اکرم ﷺ کے حکم پر رہنا ہے تو پھر تین رات سے زیادہ تراویح نہیں ہونی چاہیئے' پھر پورا مہینے کیوں پڑھتے ہیں؟ اور پڑھنی بھی تہجد کے وقت چاہیئے' عشاء کے ساتھ کیوں پڑھتے ہیں؟ یہ پورے مہینے کی تراویح اور اسے عشاء سے متصل کر کے پڑھنا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے واقعتاً بیس رکعت تراویح ثابت نہیں ہے' لیکن آپؐ سے تو تین رات کے علاوہ چوتھی رات کی جماعت بھی ثابت نہیں ہے۔

تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن

اس اعتبار سے ان دونوں چیزوں کے اندر ہم نے ایک تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ؎

کیا پابندِ نے نالے کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری!

تراویح میں قرآن مجید کا سننا اس لیے ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کا قرآن کے ساتھ ذہنی اور قلبی رشتہ استوار ہو' نہ یہ کہ امام بہت تیزی کے ساتھ طوطے کی طرح رٹا ہوا قرآن پڑھ رہا ہو اور مقتدیوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے۔ آج کل تو معاملہ یہ ہے کہ جو قاری زیادہ تیز پڑھے اس کو دادِ تحسین دی جاتی ہے کہ بہت جلد مقتدیوں کو فارغ کر دیا ہے۔ یہ تو سراسر قرآن کا مذاق اور استہزاء ہے۔ اس کے حل کے طور پر میں نے ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ تراویح کے ساتھ قرآن کے مطالب بیان کرنے کا سلسلہ شروع کیا' تا کہ ذہن وقلب کا کچھ تو قرآن کریم کے ساتھ رشتہ استوار ہو۔ پھر ۱۹۸۴ء (۱۴۰۴ھ) سے میں نے تراویح کے ساتھ ''دورۂ ترجمۂ قرآن'' کا آغاز کر دیا۔ اس کی مجھے ایک نظیر بھی مل گئی۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ سہارنپور میں تراویح کا معمول یہ تھا کہ لوگ چار رکعات تراویح پڑھ کر منتشر ہو جاتے' اس دوران کوئی قرآن کی تلاوت کرتا' کوئی وظیفہ کرتا' کوئی اپنے علیحدہ سے نوافل ادا کرتا۔ پھر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد نمازی پھر جمع ہو جاتے اور پھر چار رکعتیں ادا کر کے پھر منتشر ہو جاتے۔ تو اس طرح عشاء کی نماز سے لے کر سحری تک ان کے قیام اللیل کا یہ معمول ہوتا۔ اس کو ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بہتر شکل یہ دی کہ ہر چار رکعت تراویح میں قرآن کا جو حصہ پڑھا جانے والا ہے پہلے بیٹھ کر گھنٹے پون گھنٹے کے اندر اس کا ترجمہ اور مختصر تفسیر کر لی جائے۔ اب امام صاحب قرآن کا وہ حصہ قراءت کریں گے تو مقتدیوں کے قلوب واذہان پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ اور اگر کسی کی قرآن مجید کے ساتھ ذرا سی بھی ذہنی مناسبت ہے اور عربی کی کچھ شُد بد ہے تو پورے کا پورا قرآن اس کو سمجھ میں آئے گا۔ اب قرآن گویا ذہن میں اتر رہا ہے اور قلب پر نازل ہو رہا ہے۔ جیسے اقبال نے کہا: ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

تو اس طرح ہم نے آخری سیشن آٹھ رکعتوں کا کر کے چار سیشن میں دورۂ ترجمہ قرآن کا سلسلہ جاری کیا۔ اس سے کم از کم نصف شب جاگنے کا اہتمام ہو جاتا ہے۔ جب ہم نے اس کا آغاز کیا تھا تو چھ گھنٹوں میں نماز عشاء اور تراویح ہوا کرتی تھی۔ اُس وقت کچھ لوگوں نے شور مچا دیا کہ یہ کیا بدعت ہے؟ حالانکہ ہم نے اسے کسی پر لازم اور ضروری قرار نہیں دیا' بلکہ جس کو بھی قرآن سے شغف اور دلچسپی ہے اور وہ قرآن سے اپنے تعلق کی تجدید کرنا چاہتا ہے وہ اپنی صوابدید پر اس میں شریک ہو جائے۔ چونکہ قیام اللیل کا کم سے کم تقاضا از روئے قرآن ایک تہائی شب ہے اور بیس رکعت تراویح کا اجتہاد حضرت عمرؓ کا ہے جو خلیفۂ راشد ہیں' اس لیے ہم نے اللہ کے فضل و کرم سے ان دونوں چیزوں کو باہم جوڑ دیا ہے۔ میرا ۱۹۹۸ء کا دورۂ ترجمہ قرآن ''بیان القرآن'' کے نام سے ڈیجیٹل کیمرے پر ریکارڈ ہو چکا ہے' اور اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک مختلف ٹی وی چینلز اسے نشر بھی کر رہے ہیں۔

تکبیرِ ربّ اور شکرِ ہدایت کا حکم

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۵ میں روزوں کے حکم کے بعد فرمایا جا رہا ہے:

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

''اور تا کہ تم (روزوں کی) تعداد پوری کرو اور جس ہدایت سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی کبریائی (کا اظہار و اعتراف) کرو اور شکر گزار بنو''۔

یہ قرآن مجید کا شکر ادا کرنا ہے۔ اگر تم اس کی قدر و قیمت سے واقف ہو تو اس کے ساتھ ایک تہائی شب یا نصف شب جاگنا اس کی کچھ بھی قیمت نہیں ہے۔ یہ تو بس ذرا سی محنت ہے۔ اور: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ ''اور (اس کی ایک غرض یہ ہے) تا کہ تم اللہ کی تکبیر کرو اس ہدایت پر جس پر اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے''۔ اللہ کی تکبیر کا منطقی نتیجہ جہاد و قتال ہے' اس لیے اگلے رکوع میں آیت ۱۹۰ سے قتال کا حکم شروع ہو رہا ہے۔ آیت ۱۹۳ ہے: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) اب جنگ جاری رکھو ان (کفار و مشرکین) سے یہاں تک فتنہ بالکل فرو ہو جائے' اور دین اللہ کے لیے ہو جائے''۔ قرآن حکیم میں تین مقامات پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ''تا کہ اللہ تعالیٰ اسے (اپنے رسول ﷺ کو یا قرآن مجید کو) غالب کر دے تمام ادیان پر''۔ سورۃ المدثر میں' جو وحی کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے' آپ ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ

فَاَنۡذِرۡ ۝۲ وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۝۳﴾ ’’اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اٹھو اور خبردار کرو‘ اور اپنے ربّ کی کبریائی بیان کرو‘‘۔اس کی کبریائی قائم کرو!

ہم نے صرف زبان سے اللہ اکبر کہہ دینے کو اللہ کی کبریائی کرنا اور اس کی بڑائی بیان کرنا سمجھ رکھا ہے‘ حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں اللہ کی بڑائی قائم ہرگز نہیں ہے‘ اس کا قانون نافذ نہیں ہے۔اس کے احکام کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں۔جس چیز (سود) کو وہ اس درجے میں حرام کہتا ہے کہ اگر اس سے باز نہیں آ ؤ گے تو اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے‘ اس پر ہمارا پورا نظامِ معیشت استوار ہے۔تو اللہ بڑا کہاں ہے؟ فَکَبِّرۡ (اسے بڑا کرو) کا مطلب ہے دین قائم کرو۔سورۃ الانفال میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَقَاتِلُوۡھُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ وَّیَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ﴾(آیت ۳۹)’’اور ان (کفار و مشرکین) سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ بالکل ختم ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے خالص ہو جائے‘‘۔صرف اسی کی اطاعت ہو رہی ہو۔معاشرتی احکام بھی اسی کے ہوں۔شادی بیاہ اور پردے کے احکام اسی کے تحت ہوں‘ عائلی قوانین اسی کے تابع ہوں‘ معاشرتی اقدار وہی ہوں جو قرآن چاہتا ہے‘ جو اللہ چاہتا ہے‘ انہی اقدار کو پروان چڑھاؤ۔معاشرتی برائیوں کی بیخ کنی کرو۔دنیا میں خلافت کا نظام قائم ہو‘ معاشی نظام اسلام کے سنہری اصولوں پر قائم ہو جس میں غریب کی دادرسی ہو‘ دولت امیروں ہی کے مابین گردش میں نہ رہے۔جیسے فرمایا گیا: ﴿کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ﴾(الحشر:۷) ’’تاکہ دولت تمہارے اغنیاء کے مابین ہی گردش میں نہ رہے‘‘۔کفالتِ عامہ کا نظام قائم ہو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا: ’’اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے دن عمر ذمہ دار ہو گا‘‘۔ انسان تو بہت دُور کی بات ہے۔اس نظام کو برپا کرنے کے لیے تیاری کرو اور اس تیاری کی شکل یہ ہے کہ قرآن سے تمہارا ربط و تعلق مضبوط ہو۔اس اعتصام بالقرآن کے لیے ہی یہ عبادت ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔

قرآن مجید کی عظمت وفضیلت

قرآن مجید کی عظمت و فضیلت کے ضمن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ایک حدیث نبویؐ ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:((اَلَا اِنَّھَا سَتَکُوۡنُ فِتۡنَۃٌ)) ’’خبردار! عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہو گا‘‘۔فَقُلۡتُ مَا الۡمَخۡرَجُ مِنۡھَا یَارَسُوۡلَ

اللہ ﷺ؟ ''تو میں نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسولؐ! اس فتنے سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟'' یہ قابل غور بات ہے۔ہم ہوتے تو پوچھتے کہ حضور یہ فتنہ کب ہوگا' کیوں ہوگا' کدھر سے آئے گا' کیسا ہوگا؟؟ یہ سارے معلوماتی سوالات ہیں۔عملی بات وہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمائی کہ حضور اس سے بچاؤ کی شکل کیا ہوگی؟اب آپؐ نے فرمایا: ((کِتَابُ اللّٰہِ)) ''(اس فتنہ سے بچانے والی شے)اللہ کی کتاب ہے''۔((فِیْہِ نَبَأُ مَا کَانَ قَبْلَکُمْ)) ''اس میں تم سے پہلے والوں کی بھی خبریں ہیں'' ((وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ)) ''اور جو کچھ تمہارے بعد ہونے والا ہے اس کی اطلاعات بھی ہیں'' ((وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ)) ''اور اس میں تمہارے مابین ہونے والے اختلافات کا فیصلہ بھی ہے''((وَھُوَ الْفَصْلُ لَیْسَ بِالْھَزْلِ)) ''وہ اللہ کا فیصلہ کن کلام ہے'یاوہ گوئی نہیں ہے''۔((مَنْ تَرَکَہٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَہُ اللّٰہُ))''جو سرکش اس قرآن کو ترک کردے گا اللہ اسے پیس کر رکھ دے گا'' ((وَمَنِ ابْتَغَی الْھُدٰی فِیْ غَیْرِہٖ اَضَلَّہُ اللّٰہُ)) ''اور جو شخص ہدایت تلاش کرے گا قرآن کے سوا کسی شے میں اسے اللہ لازماً گمراہ کر دے گا''((وَھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ))''اور یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے''((وَھُوَ الذِّکْرُ الْحَکِیْمُ)) ''اور یہی بہت حکمت والا ذکر ہے''((وَھُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ))''اور یہی تو صراط مستقیم ہے(جس کی دعا تم کرتے ہو)'' ((ھُوَ الَّذِیْ لَا تَزِیْغُ بِہِ الْاَھْوَاءُ))''یہ وہ شے ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے خواہشِ نفس کج نہیں ہوسکتی'' ((وَلَا تَلْتَبِسُ بِہِ الْاَلْسِنَۃُ))''اور زبانیں اس کو گڑبڑ نہیں کرسکتیں'' (یعنی اگلی کتابوں کی طرح اس میں زبانوں کی راہ سے تحریف ممکن نہیں)'' ((وَلَا یَشْبَعُ مِنْہُ الْعُلَمَاءُ)) ''اور علماء اس سے کبھی سیر نہیں ہوسکیں گے(اس کے بار بار پڑھتے رہنے سے دلچسپی قطعاً کم نہیں ہوگی)'' ((وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَۃِ الرَّدِّ)) ''اور بار بار کے تکرار سے اس کے اوپر کوئی بوسیدگی (پرانا پن) طاری نہیں ہوگی''۔((وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ)) ''اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے(یہ ہیروں کی ایسی کان ہے جس میں ہیرے کبھی ختم نہیں ہوں گے)'' ((ھُوَ الَّذِیْ لَمْ تَنْتَہِ الْجِنُّ اِذْ سَمِعَتْہُ حَتّٰی قَالُوْا : اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّھْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ)) ''اور یہ وہ شے ہے کہ جس کو جنّوں کی ایک جماعت نے سنا تو سنتے ہی یہ کہا کہ: ہم نے ایک ایسا کلام سنا ہے جو بڑا عجیب ہے (بہت خوبصورت ہے)'جو سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے(ہدایت دیتا ہے) پس ہم تو ایمان لے آئے''۔

اس حدیث مبارکہ کے آخری چار جملے بڑے عظیم ہیں: ((مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ)) ''جس نے کوئی بات اس قرآن کی بنیاد پر کہی اس نے سچ کہا''۔ جیسے میں نے آج آپ سے کہا کہ رمضان کی تراویح کا کم سے کم حق ایک تہائی شب ہے' تو میں یہ قرآن کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ ((وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ)) ''اور جس نے اس قرآن پر عمل کیا اس نے اجر پایا (اس کا اجر محفوظ ہے)''۔ ((وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ)) ''اور جو اِس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرے اس نے عدل کیا'' ((وَمَنْ دَعَا اِلَيْهِ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ))(۹) ''اور جس نے اس قرآن کی طرف لوگوں کو بلایا اس کو سیدھے راستے کی ہدایت مل گئی''۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

حواشی

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب الترغیب فی النکاح۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ذکر الملائکة **اور متعدد دوسرے ابواب۔**
وصحیح مسلم' کتاب القدر' باب کیفیة خلق الآدمی فی بطن امه و کتابة رزقه واجله۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب هل یقول انی صائم اذا شتم۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل الصیام۔

(٤) رواه البیهقی فی شعب الایمان۔

(۵) مسند احمد والطبرانی والبیهقی۔

(٦) صحیح البخاری وصحیح مسلم۔ **(اس حدیث کے مختلف جملے بخاری ومسلم کی متفرق روایات میں آئے ہیں۔)**

(۷) صحیح البخاری' کتاب صلاة التراویح' باب فضل من قام رمضان۔

(۸) سنن ابن ماجه' المقدمة ' باب اتباع سنة الخلفاء الراشدین المهدیین۔

(۹) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن' باب ما جاء فی فضل القرآن۔ وسنن الدارمی' کتاب فضائل القرآن' باب فضل من قرأ القرآن۔

ربّ ہمارا

ڈاکٹر عبدالسمیع

ایمان باللہ کے حوالے سے یہ بات سب جانتے ہیں کہ جب ایمان انسان کے دل میں واقعتاً جاگزیں ہو جائے تو اسے اطمینان نصیب ہوتا ہے' مگر میں اس سے بڑھ کر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اطمینان اور سکون صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا ربّ ماننے سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۰﴾﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

''بے شک وہ لوگ جو کہیں ہمارا ربّ اللہ ہے' پھر اس بات پر ڈٹ جائیں تو ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) نازل ہوں گے کہ نہ تو خائف ہوں اور نہ ہی غمگین' بلکہ خوش ہو جاؤ جنت کی اس خوشخبری پر جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔''

ربّ کا مفہوم

سوال یہ ہے کہ ''ربّ'' کا معنی ومفہوم کیا ہے؟ لفظ ''ربّ'' کا مادہ ر ب ب ہے جس کا بنیادی مفہوم پرورش ہے۔ اسی سے اس میں تصرف' خبر گیری' اتمام وتکمیل' فوقیت و بالادستی اور مالکیت وآقائی کے مفہومات پیدا ہو گئے۔ ہمارے ہاں اس کا مفہوم 'پروردگار' تک محدود کر دیا گیا ہے' حالانکہ یہ وسیع معانی کا حامل لفظ ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ پانچ مفہومات کے لیے استعمال ہوا ہے' جو درج ذیل ہیں:

(۱) پروردگار' یعنی وہ ہستی جو درجہ بدرجہ ترقی دے کر مرتبۂ کمال کو پہنچائے۔

(۲) دیکھ بھال اور اصلاحِ احوال کا ذمہ دار۔

(۳) مرکزی حیثیت کی مالک ہستی۔

(۴) مطاع' ذی اقتدار ہستی' جس کا حکم چلے' جس کی بالادستی تسلیم کی جائے —— اور

(۵) مالک اور آقا۔

مشرکین کی اصل گمراہی

اب سوال یہ ہے کہ وہ مشرکینِ عرب جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے' ربوبیت کے باب میں ان کی اصل گمراہی کس نوعیت کی تھی؟ کیا وہ اللہ سے ناواقف تھے یا اُس کی ہستی کے منکر تھے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ قرآن مجید بتاتا ہے کہ نزولِ قرآن سے پہلے بھی مشرکین مکہ نہ صرف اللہ کو جانتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کو اپنا' اپنے معبودوں اور کائنات کا خالق و مالک بھی تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ سورۃ العنکبوت میں فرمایا گیا:

﴿وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ﴾ (آیت ۶۱)

''اور (اے نبیؐ) اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا' تو لازماً یہ کہیں گے کہ اللہ نے!''

خالق کائنات کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کو 'ربّ' بھی مانتے تھے' جیسا کہ سورۃ المؤمنون کی آیات ۸۴ تا ۸۷ سے معلوم ہوتا ہے:

﴿قُلۡ لِّمَنِ الۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۸۵﴾ قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبۡعِ وَرَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۸۷﴾﴾

''(اے نبیؐ ان سے) کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے سب کس کا مال ہے؟ جھٹ بول اٹھیں گے کہ اللہ کا! کہو پھر کیا تم سوچتے نہیں؟ (اُن سے) پوچھو کہ سات آسمانوں کا مالک کون ہے اور عرش عظیم کا کون مالک ہے؟ بے ساختہ کہہ دیں گے کہ یہ (چیزیں) اللہ ہی کی ہیں! کہو پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟''

مشرکین کی اصل گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے ربوبیت کے مفہومات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پروردگار اور خبر گیر کے مفہوم میں وہ اللہ کو ربِّ اعلیٰ مانتے تھے' اگرچہ اس کے ساتھ شریک بھی ٹھہراتے تھے۔ تاہم ان معنوں میں کہ اللہ تعالیٰ ہدایت و رہنمائی کا منبع اور قانون عطا کرنے والا ہے' وہ اللہ کو ربّ تسلیم نہیں کرتے تھے' بلکہ اللہ کی بجائے انسانوں کو ربّ مانتے تھے۔ وہ ''ربّ'' کا لفظ اپنے سرداروں اور وڈیروں کے لیے بولتے تھے۔ مثال کے طور پر اُمیہ بن خلف اپنے آپ کو حضرت بلال کا ربّ کہلواتا تھا اور حضرت بلال اُمیہ کے 'عبد'

تھے۔اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا انسانوں سے ہمیشہ یہ مطالبہ رہا ہے کہ وہ ربوبیت کے تمام مفہومات میں صرف اللہ تعالیٰ کو 'ربّ' مانیں اور تنہا اس کی 'بندگی' کریں۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''ربّ کا یہ مفہوم کہ وہ فوق الفطری طور پر مخلوقات کی پرورش' خبر گیری' حاجت روائی اور نگہبانی کا کفیل ہوتا ہے' ان (مشرکین) کی نگاہ میں ایک الگ نوعیت رکھتا تھا' اور اس مفہوم کے اعتبار سے وہ اگرچہ ربّ اعلیٰ تو اللہ ہی کو مانتے تھے' مگر اس کے ساتھ فرشتوں اور دیوتاؤں کو' غیر مرئی قوتوں کو' ستاروں اور سیاروں کو' انبیاء اور اولیاء اور روحانی پیشواؤں کو بھی ربوبیت میں شریک ٹھہراتے تھے۔

اور ربّ کا یہ مفہوم کہ وہ امر و نہی کا مختار' اقتدارِ اعلیٰ کا مالک' ہدایت و رہنمائی کا منبع' قانون کا ماخذ' مملکت کا رئیس اور اجتماع کا مرکز ہوتا ہے' ان کے نزدیک بالکل ہی ایک دوسری حیثیت رکھتا تھا' اور اس مفہوم کے اعتبار سے وہ یا تو اللہ کے بجائے صرف انسانوں کو ربّ مانتے تھے یا نظریے کی حد تک اللہ کو ربّ ماننے کے بعد عملاً انسانوں کی اخلاقی و تمدنی اور سیاسی ربوبیت کے آگے سرِ اطاعت خم کیے دیتے تھے۔

اسی گمراہی کو دور کرنے کے لیے ابتداء سے انبیاء علیہم السلام آتے رہے ہیں اور اسی کے لیے آخر کار محمد ﷺ کی بعثت ہوئی۔ان سب کی دعوت یہ تھی کہ ان تمام مفہومات کے اعتبار سے ربّ ایک ہی ہے اور وہ اللہ جل شانہٗ ہے۔ربوبیت ناقابلِ تقسیم ہے۔اس کا کوئی جزء کسی معنی میں بھی کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے۔کائنات کا نظام ایک کامل مرکزی نظام ہے جس کو ایک ہی خدا نے پیدا کیا۔جس پر ایک خدا فرماں روائی کر رہا ہے' جس کے سارے اختیارات و اقتدارات کا مالک ہی خدا ہے۔نہ اس نظام کے پیدا کرنے میں کسی دوسرے کا کچھ دخل ہے' نہ اس کی تدبیر و انتظام میں کوئی شریک ہے' اور نہ اس کی فرماں روائی میں کوئی حصہ دار ہے۔مرکزی اقتدار کا مالک ہونے کی حیثیت سے وہی اکیلا خدا تمہارا فوق الفطری ربّ بھی ہے اور اخلاقی و تمدنی اور سیاسی ربّ بھی۔وہی تمہارا معبود ہے۔وہی تمہارے سجدوں اور رکوعوں کا مرجع ہے۔وہی تمہاری دعاؤں کا ملجا و ماویٰ ہے۔وہی تمہارے توکل و اعتماد کا سہارا ہے۔وہی تمہاری ضرورتوں کا کفیل ہے اور اسی طرح وہی بادشاہ ہے۔وہی مالک الملک ہے' وہی شارع و قانون ساز اور امر و نہی کا مختار بھی ہے۔ربوبیت کی یہ دونوں حیثیتیں جن کو جاہلیت کی وجہ سے تم نے ایک دوسرے سے الگ ٹھہرا لیا ہے' حقیقت میں خدائی لازمہ

اور خدا کے خدا ہونے کا خاصہ ہیں۔ انہیں نہ ایک دوسرے سے منفک کیا جا سکتا ہے' اور نہ ان میں سے کسی حیثیت میں بھی مخلوقات کو خدا کا شریک ٹھہرانا درست ہے''۔

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات' ایڈیشن ۳۵' ص ۶۵' ۶۶)

رسول اللہ ﷺ سے مشرکین کی وجہِ عناد

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مشرکین مکہ کی نبی اکرم ﷺ کی مخالفت کا بنیادی سبب یہی تھا کہ آپؐ نے انہیں ربّ کو پورے طور سے تنہا ربّ ماننے کی دعوت دی۔ دیکھیں' مکہ ایک ایسی بستی تھی جس میں سب لوگ ایک دوسرے سے متعارف تھے۔ چنانچہ قریش آنحضور ﷺ کو محمد بن عبداللہ کے نام سے جانتے تھے۔ وہ آپؐ کے خاندان اور پیشے سے بھی آگاہ تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ شخص انتہائی سچا اور حد درجہ دیانت دار ہے۔ تو کیا وہ اس بات سے بے خبر رہ سکتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ اُن کے بتوں کو سجدہ نہیں کرتے' بلکہ اللہ واحد کی بندگی کرتے ہیں؟ یقیناً وہ اس بات سے آگاہ تھے' مگر اس کے باوجود قریش نے چالیس سال تک آپؐ سے اختلاف نہیں کیا' بلکہ حجر اسود کی تنصیب جیسے حساس معاملے میں آپؐ کو جج بنایا' اور پھر آپؐ کا فیصلہ بخوشی قبول کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت محمد عربی ﷺ کے ساتھ قریش کا تب تک کوئی جھگڑا نہ تھا۔ جھگڑا اُس وقت شروع ہوا جب انہیں معلوم ہوا کہ محمد (ﷺ) اللہ کو ہمارا ''ربّ'' قرار دیتے ہیں' اس معنی میں کہ ہم اسے مطاعِ مطلق مانیں' اسے ربّ مان کر' اس کے ہر ہر حکم پر چلیں' اُس کے بتائے ہوئے طریق زندگی کو اختیار کریں۔ اس پر وہ آپؐ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔

آج بھی آسمانی ہدایت کی نفی کی جا رہی ہے' اور یہی درحقیقت سیکولرازم کی اصل روح اور بنیاد ہے' کیونکہ سیکولرازم کا مطلب ہی یہ ہے کہ To reduce the role of religion in morality and education یعنی ''اخلاقیات (صحیح اور غلط کا تعین) اور نظامِ تعلیم میں مذہب کے عمل دخل کو کم کرنا''۔ پرستش میں خواہ کوئی شخص کتنا ہی منہمک ہو جائے' سیکولرازم کو اُس سے کوئی تعرض نہیں۔ وہ دنیا کو چھوڑ کر کسی کونے میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ مسجد میں خواہ صبح و شام 'اللہ اکبر' کا ورد کرتا رہے' اسے اجازت ہے' مگر سڑک پر آ کر کوئی نعرۂ تکبیر بلند کرے' اللہ کی کبریائی کا اعلان کرے' اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جو شخص اللہ کو ربّ مانتے ہوئے اس کا حکم منوانا اور نافذ کرنا چاہتا ہے'

3

وہ سیکولر طاغوتی دنیا کی نگاہ میں انتہا پسند ہے۔ گویا طاغوت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو الٰہ واحد ماننا اور اسے خالقِ کائنات تسلیم کرنا جرم نہیں' اصل جرم یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ کو ربّ مانتے ہوئے اس کے نظامِ بندگی کی ترویج کی کوشش کرے۔ چنانچہ نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کے متعلق امریکی صدر بش نے کہا تھا:

''ہم اسلامی 'فاشزم' کے خلاف جنگ آزما ہیں' جس کے مقاصد ہیں: از سرنو خلافت قائم کرنا' مغربی تہذیب کو دھمکانے کے لیے پٹرول کے چشموں پر تسلط اور اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے ختم کر دینا''۔

عبد کا معنی و مفہوم

اللہ تعالیٰ ہمارا ربّ ہے' اور ہم اس کے عبد (بندے) ہیں۔ ''عبد'' کے معنی غلام کے ہیں' اور غلام وہ ہوتا ہے جس کے پیش نظر اپنے مالک کی مرضی ہوتی ہے۔ وہ زندگی کا ایک ایک پل اس کی ہدایت کے مطابق گزارتا ہے۔ افسوس کہ عبد کا یہ مفہوم آج ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ قرآن حکیم کے انگریزی تراجم میں بھی صرف محمد مارماڈیوک پکتھال نے اس کا ترجمہ 'slave' کیا ہے' ورنہ بعد کے تراجم میں اس کا ترجمہ bondsman اور جدید تراجم میں humble servant کیا گیا۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ slave (غلام) اور servant (ملازم) میں واضح طور پر فرق ہے۔ غلامی (سوائے اللہ کی غلامی کے) کبھی اپنے انتخاب و اختیار (choice) سے نہیں ہوتی' جبکہ ملازمت اپنے اختیار اور مرضی سے ہوتی ہے۔ فرض کریں' آپ کو ایک ملازم کی ضرورت ہے۔ آپ اخبار میں ایک اشتہار دیتے ہیں' جسے دیکھ کر بہت سے لوگ حصولِ ملازمت کے لیے آ جائیں گے۔ اب آپ کیا کریں گے؟ یہی نا کہ آپ ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے چند شرائط کے ساتھ ملازم رکھ لیں گے۔ شرائط ملازمت میں اوقاتِ کار اور مراعات کے ساتھ ساتھ کام کی نوعیت بھی واضح طور پر بتائی جائے گی۔ اب آپ پابند ہیں کہ انہی شرائط کے ساتھ اس سے کام لیں' کیونکہ پہلے سے کام کی نوعیت' اوقاتِ کار اور معاوضہ وغیرہ جو طے ہو چکا ہے وہ ملازم کے حقوق ہیں' جو آپ کو بہر صورت ادا کرنا ہوں گے۔ اس کے بالکل برعکس معاملہ غلام کا ہے۔ اُس کے نہ تو اوقاتِ کار ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی حقوق۔ ہم اللہ کے غلام ہیں۔ ہمارا کام پوری زندگی اللہ کے احکام اور ہدایات کے مطابق بسر کرنا ہے' تاکہ وہ ہم سے راضی ہو۔ ہم جاگتے ہوئے ہی نہیں سوتے

ہوئے بھی اس کے غلام ہیں‘ صبح وشام‘ دن رات کے غلام! ہمارے ہاں ’’عبد‘‘ کے ترجمے میں ’’کلی غلامی‘‘ کا مفہوم نکال دیا گیا‘ صرف پرستش کا مفہوم باقی رکھا گیا‘ حالانکہ پرستش ایک عمل (act) ہے‘ جس کی ابتدا بھی ہوا کرتی ہے اور انتہا بھی۔ مثال کے طور پر نماز پرستش ہے۔ اس کا آغاز تکبیر تحریمہ (اللہ اکبر) سے ہوتا ہے اور سلام (السلام علیکم ورحمۃ اللہ) پر یہ ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح روزے کا معاملہ ہے‘ جو صبح اذانِ فجر سے شروع ہوتا ہے اور اذانِ مغرب پر اختتام پذیر ہو جاتا ہے‘ علیٰ ہٰذا القیاس —— لیکن غلامی کی نہ ابتدا ہوتی ہے نہ انتہا۔ یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم اللہ کو اپنا ربّ مانتے ہوئے‘ زندگی کی آخری سانس تک اُس کی اطاعت کریں۔

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَ لَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾﴾

’’اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے‘ اور تمہیں موت نہ آئے مگر اسلام (فرماں برداری) کی حالت میں‘‘۔

تصورِ بندگی کا نتیجہ: صبر و رضا

ملازمت اور غلامی کے دو مختلف تصورات سے انسان کی عملی زندگی میں بھی نمایاں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ کا نوکر (servant) سمجھے گا تو اس کا طرزِ عمل نوکروں کا سا ہوگا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنا حق مانگے گا‘ اور اگر اللہ تعالیٰ اس کی خواہش پوری نہ کرے تو وہ پریشان ہو جائے گا‘ اس سے گلے شکوے کرے گا۔ اس کے برعکس جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ میں اللہ کا غلام ہوں‘ وہ چاہے تو مجھے کچھ دے اور چاہے تو محروم رکھے‘ وہ چاہے تو مجھے حسن و خوبصورتی عطا کرے اور چاہے تو بدصورت اور عیب والا بنا دے‘ چاہے تو صحت و تندرستی سے نوازے اور چاہے تو بیماریوں میں مبتلا کر دے‘ چاہے تو اولاد کی نعمت سے سرفراز کرے اور چاہے بے اولاد رکھے‘ یہ میرے مالک کی مرضی اور اختیار ہے‘ اُس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا‘ تو ایسا شخص ہر حال میں مطمئن اور راضی بہ رضائے ربّ رہے گا۔

رضائے ربّ پہ راضی رہ‘ یہ حرفِ آرزو کیسا؟
خدا خالق‘ خدا مالک‘ خدا کا حکم‘ تو کیسا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام روزِ قیامت اپنے ماننے والوں کے بارے میں جو سفارش کریں گے اس کا انداز یہی ہوگا۔ اس کے لیے سورۃ المائدۃ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُکَ ۚ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۱۸﴾﴾

''اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔ اور اگر انہیں (اپنی مہربانی سے) بخش دے تو بے شک تو غالب (اور) حکمت والا ہے۔''

جب اللہ تعالیٰ ہمارا ربّ اور مالک و مختار ہے اور ہم اس کے بندے اور غلام ہیں تو پھر ہمارے کوئی حقوق اور مراعات (privileges) نہیں‘ کسی قسم کا کوئی استحقاق نہیں۔ وہ ہمیں کچھ دے یا بالکل محروم رکھے‘ یہ اُس کا اختیار ہے۔ ہمارے اوقاتِ کار مقرر نہیں کہ ہم یہ سمجھیں کہ ان اوقات میں تو مالک کی پرستش کریں گے‘ باقی وقت اپنی مرضی کے مطابق گزاریں گے۔ نہیں‘ بلکہ ہم چوبیس گھنٹے اللہ کے غلام ہیں۔ زندگی کی آخری گھڑی تک اس کے بندے ہیں۔ جب بندگی اور غلامی کی یہ حقیقت سامنے آ جائے تو انسان کا نقطۂ نظر یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسے کبھی احساسِ محرومی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا‘ کیونکہ احساسِ محرومی تو نتیجہ ہوتا ہے اس سوچ کا کہ میں حق دار تھا‘ مگر محروم رکھا گیا۔ اگر معلوم ہو کہ میرا تو سرے سے کوئی حق تھا ہی نہیں کہ جس سے میں محروم کر دیا گیا تو پھر احساسِ محرومی کا کیا سوال؟...... اور یہ بات تو ہر ایک پر عیاں ہے کہ جب احساسِ محرومی نہ رہے تو ذہنی تناؤ نہیں ہوتا‘ اور ذہنی تناؤ نہ ہو تو آدمی ڈپریشن کا شکار ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

بندگیٔ ربّ: زندگی کا اصل مقصد

قرآن مجید کا اصل پیغام بندگیٔ ربّ کی دعوت ہے۔ نبی آخر الزمان ﷺ اور تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی اصل دعوت بندگیٔ ربّ تھی۔ ہر نبی نے اپنی قوم سے یہی مطالبہ کیا: ﴿یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ﴾ (الاعراف) ''اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو‘ اُس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں''۔ بندگیٔ ربّ کی جو دعوت ہر رسول نے اپنی قوم کو دی‘ وہی دعوت نبی آخر الزمان حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے بنی نوعِ انسان کے سامنے پیش کی:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ (البقرۃ)

''اے لوگو! بندگی کرو اپنے اُس ربّ کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور اُن سب کو جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں‘ تاکہ تم بچ سکو۔''

بلا شبہ جنات اور انسان کی زندگی کا مقصد ہی بندگی ٔ ربّ ہے۔قرآن عزیز کہتا ہے:

﴿وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ۝۵۶﴾ (الذّٰریٰت)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔''

بندگی کے تقاضے

اللہ کی بندگی کے بہت سے تقاضے ہیں' جنہیں پورا کیا جانا لازم ہے۔ان میں سے چند ایک کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

پہلا تقاضا: اللہ سے مدد مانگنا

بندگی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم جو چیز بھی مانگیں اللہ تعالیٰ سے مانگیں' اس کے علاوہ کسی اور کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کریں۔دنیا کا دستور ہے کہ جب دو انسانوں میں آقا اور غلام کا تعلق قائم ہوتا ہے تو غلام اپنی ضروریات کے لیے آقا ہی سے رجوع کرتا ہے' اسی سے مانگتا ہے۔یہ معاملہ محض غلام کا نہیں بلکہ ایک ملازم بھی اپنی ضرورت کا اظہار اپنے افسر کے سامنے ہی کرتا ہے۔اور اگر کسی اور کے سامنے ایسا کیا جائے تو یہ بات پسند نہیں کی جاتی۔فرض کریں آپ کے ذاتی ملازم کو کوئی مسئلہ درپیش ہے یا اس کی کوئی ضرورت ہے' مگر وہ اس کا اظہار آپ سے نہ کرے' بلکہ آپ کے مہمان کے سامنے اپنا دکھڑا بیان کرنے لگے اور اس سے مدد کا خواستگار ہو' تو آپ کو کیسا لگے گا؟ ظاہر ہے آپ اسے پسند نہیں کریں گے۔ذرا سوچیے' ایک افسر یہ بات پسند نہیں کرتا کہ اس کا ملازم کسی اور کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار کرے اور اس سے مدد مانگے' تو اللہ تعالیٰ' جس کے ہم کل وقتی غلام ہیں' یہ بات کیسے گوارا کرسکتا ہے کہ ہم اُس کو چھوڑ کر اس کی مخلوق میں سے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں؟ پس اللہ کی بندگی اور غلامی کا تقاضا ہے کہ ہم صرف اسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔سورۃ الفاتحہ جس کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کا تعارف بطور ربّ العالمین کرایا گیا ہے' کی آیت ۷ میں صرف اللہ کی بندگی بجالانے اور صرف اسی سے استعانت کا تذکرہ ہے:﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ۝﴾ ''(اے ربّ) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں''۔اور چونکہ مدد کرنے میں سب سے اہم چیز صحیح سمت کی رہنمائی کرنا ہے' لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی مانگتے ہیں کہ:﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ۵ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا

الضَّآلِّيۡنَ﴿۷﴾ یعنی ’’(اے اللہ!) تو ہمیں سیدھا راستہ دکھا‘ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا‘ جن پر تیرا غضب نہیں ہوا اور جو گمراہ نہیں ہوئے‘‘۔

دوسرا تقاضا: اللہ سے ڈرنا

بندگی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے ہمہ وقت ڈریں۔ انسان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے ربّ اور خود اپنی ہیئت کو بھول جاتا ہے‘ وہ سمجھتا ہے کہ میرے اوپر کوئی چیک نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نفس کی پیروی کرتا ہے اور اخلاقی ضابطوں کو پامال کرتا ہے‘ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ ایسا کرنے سے اسے فوری طور پر کوئی نقصان نہیں ہوتا‘ جیسا کہ طبعی قوانین کی خلاف ورزی پر ہوتا ہے‘ کہ اگر وہ گرم دودھ پی لے تو اُس کی زبان پر آبلے پڑ جاتے ہیں‘ آلودہ کھانا کھانے سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے وغیرہ۔ چنانچہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے‘ جھوٹ بولتا ہے‘ کسی کا مال ناحق کھانا ظلم ہے‘ دوسروں کا مال ہڑپ کر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بتاتا ہے کہ اے میرے بندو! جیسے طبعی قوانین کی خلاف ورزی سے تم نقصان سے دوچار ہوتے ہو اسی طرح اخلاقی ضابطوں کی پامالی سے بھی تمہیں سخت نقصان ہو گا۔ یقیناً تم سے تمہارے اعمال کی بابت باز پرس ہو گی۔ دنیا میں تم جو کچھ کرو‘ بالآخر تمہیں میرے حضور پیش ہونا پڑے گا۔ ﴿اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی ؕ﴿۸﴾﴾ (العلق) ’’بے شک تمہیں اپنے ربّ کے حضور پلٹنا ہے‘‘۔ دنیا کا بھی یہی اصول ہے کہ انسان جس شخص کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ وہ مجھ پر اختیار اور کنٹرول رکھتا ہے‘ اس کے دل میں اس کا ڈر بھی ہوتا ہے‘ جیسے مل یا کارخانے کا مالک یا جی ایم وغیرہ۔ بلکہ لوگ اس شخص سے بھی خوف زدہ ہوتے ہیں جو مل کے مالک سے بہتر تعلقات رکھتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے بھئی خیال رکھنا‘ فلاں ’’میاں صاحب‘‘ کا بندہ ہے۔

تیسرا تقاضا: اللہ سے کامل وفاداری

اللہ تعالیٰ سے کامل وفاداری اس کی بندگی کا اہم تقاضا ہے۔ انسان میں سرکشی کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ وہ لامحالہ اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے‘ اگرچہ وہ بظاہر اللہ کو اپنا ربّ تسلیم کرتا ہو۔ البتہ یہ نافرمانی اگر نافرمانی ہی رہے‘ بغاوت نہ ہو‘ تو یہ قابل معافی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہوئی‘ وہ اس پر نادم ہوئے اور توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا۔ لیکن اگر نافرمانی بغاوت کی صورت اختیار کرے‘ اور بے خوفی اور دیدہ دلیری

سے احکاماتِ الٰہی پامال کیے جا رہے ہوں' اور اس پر کوئی ندامت اور پچھتاوا نہ ہو' تو یہ روش تباہی کا باعث بنتی ہے۔ شیطان اسی لیے راندۂ درگاہ ہوا۔ اور یہ ایسی بات نہیں جسے سمجھنا مشکل ہو' بلکہ یہ بہت آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ آپ دیہات اور گاؤں میں چلے جائیں تو وہاں آپ دیکھیں گے کہ اگر کوئی وڈیرہ اپنے کسی ملازم کے بارے میں یہ رائے رکھتا ہو کہ وہ اسی کا بندہ ہے اور وفادار ہے' تو اس کی بڑی سے بڑی غلطیوں کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے' مگر اسے جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے ملازم نے اسے چھوڑ کر کسی دوسرے وڈیرے سے ساز باز کی ہے اور اُس کی وفاداری کا دم بھرا ہے' تو وہ اسے ہرگز برداشت نہیں کرے گا' اور اگر اُس کا بس چلے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے جان سے مروا دے۔

ہمارا ربّ جو علیم بذات الصدور ہے' خوب جانتا ہے کہ کون شخص بغاوت کر رہا ہے اور کون ہے جس نے نافرمانی کی ہے۔ دو افراد نافرمانی کر رہے ہوں تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بڑے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کر رہا ہو اور دوسرے کا جرم اگرچہ نسبتاً ہلکا ہو' مگر بغاوت اور سرکشی پر مبنی ہو' تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے کہ ہلکا جرم کرنے والا بغاوت کی بنیاد پر جرم کر رہا ہے' جبکہ دوسرا شخص اگرچہ بڑا جرم کر رہا ہے مگر جذبات کی رو میں بہہ کر یا صرف کاہلی کی بنیاد پر کر رہا ہے۔ پس جب تک اللہ کے علم کے مطابق کوئی شخص اللہ کو اپنا ربّ تسلیم کر رہا ہے تو خواہ اس سے کبھی اللہ کی نافرمانی بھی ہو جاتی ہو' اس کی بخشش کا امکان ہے' اگرچہ یہ بھی بندے کا حق ہرگز نہیں ہے' سراسر اللہ کی رحمت و عنایت ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اللہ کو ربّ ماننے ہی سے انکار کر دے تو پھر وہ کسی رعایت کا حق دار نہیں رہتا۔ جب تک یہ راز نہ کھلے اللہ کی بخشش اور اجر و ثواب کے حصول کے لیے قرآن میں بیان کردہ ایمان کی شرط سمجھ نہیں آتی اور یہ تأثر ابھرتا ہے کہ (نعوذ باللہ) مسلمانوں کے ساتھ رعایتی معاملہ کیا جائے گا اور غیر مسلموں کے ساتھ بلاوجہ امتیازی سلوک!

چوتھا تقاضا: اللہ کے کاز کو پروموٹ کرنا

انسان جس کا بندہ ہوتا ہے' اسی کے ''کاز'' کو پروموٹ کرتا ہے۔ صبح' شام' دن' رات کھڑے' بیٹھے ہر صورت میں اسی کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ بندہ تو کسی اور کا ہو اور پروموٹ کسی اور کے کاز کو کرے۔ جو شخص اللہ کو اپنا ربّ مان لے' خواہ وہ بادشاہ ہو یا محکوم و مجبور' ہر حال میں خود کو اللہ کا بندہ کہے گا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر جب ان کا نام نہاد مالک اُمیہ

بن خلف تشدد کرتا تھا‘ تو ان کی زبان پر صرف اَحد اَحد کے الفاظ آتے تھے۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ میرا ربّ وہ وحدہٗ لاشریک ہستی ہے جو کائنات کی خالق و مالک ہے۔ میں اُس کے علاوہ کسی اور کو اپنا ربّ نہیں مانتا‘ اور یہی بات اُمیہ کو ناگوار تھی۔ ورنہ بالفرض صورت یہ ہوتی کہ حضرت بلال ؓ اپنے نام نہاد آقا کے پاس جاتے اور کہتے صاحب! میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کی خدمت میں قبل ازیں کوتاہی کرتا رہا ہوں‘ مگر اب میں محمد بن عبداللہ پر ایمان لے آیا ہوں‘ لہٰذا آج سے آپ کی خدمت میں کوتاہی نہیں کروں گا‘ تو اس پر اُمیہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا۔

آجر (employer) کی اصل ضرورت ایک فرض شناس ملازم کی ہوتی ہے۔ اگر آپ کو اپنی دکان یا دفتر کے لیے کسی ملازم کی ضرورت ہو تو آپ کیا کریں گے؟ یہی نا کہ کسی دیانت دار شخص کو تلاش کریں گے‘ ایسا شخص جو آپ کی عدم موجودگی میں آپ کے مفادات کا تحفظ کر سکے‘ آپ کے کاروبار کی ترقی کے لیے کوشاں رہے‘ اور اُس کے ہونے کی بنا پر آپ حسب منشا آرام بھی کر سکیں اور اپنی معاشرتی ذمہ داریاں بھی نبھا سکیں‘ مزید برآں اپنے کاروبار کو وسعت دے سکیں۔ فرض کیجیے‘ آپ کو مطلوبہ ملازمت کے لیے دو ایسے افراد مل جاتے ہیں جن میں سے ایک مسلمان ہے اور دوسرا غیر مسلم‘ لیکن آپ کے علم میں یہ بات آتی ہے کہ مسلمان بددیانت ہے اور غیر مسلم دیانت دار‘ تو اب آپ خواہ کتنے ہی عملی مسلمان ہوں‘ آپ مسلمان کو ملازم نہیں رکھیں گے بلکہ غیر مسلم کو رکھیں گے‘ بلکہ دورانِ ملازمت اسے عبادت کے لیے چھٹی بھی دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی ضرورت ایک دیانت دار اور وفادار ملازم ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارا ربّ ہے۔ وہ ہم سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ ہم اُس کے وفادار ہوں۔ جب ہم نے اسے اپنا رب مان لیا ہے تو اب ہم خواہ مسجد میں ہوں یا گھر میں‘ زمین پر ہوں یا سمندر اور فضا میں‘ ہم خواہ معمولی مزدور ہوں یا ملک کے اعلیٰ ترین عہدے دار‘ صدر اور وزیر اعظم‘ ہر جگہ‘ ہر وقت اور ہر حال میں یہ بات مستحضر رکھیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں‘ لہٰذا اُسی کے کاز کو پروموٹ کریں گے۔ ہم نہ صرف اپنی ذات پر اللہ کے احکام کو نافذ کریں گے‘ اور اس کی منع کردہ چیزوں سے اپنے آپ کو بچائیں گے‘ بلکہ اپنے خاندان‘ معاشرے اور ریاست کی سطح پر اس کے عطا کردہ نظامِ زندگی کو غالب کرنے کی جدوجہد کریں گے۔ دین کی سربلندی کے لیے اپنی جان‘ اپنا مال‘ اپنے اوقات اور اپنی صلاحیتیں وقف کر دیں گے‘ اور ہماری ہر کاوش و

جدوجہد محض اس لیے ہوگی کہ ہمارا ربّ ہم سے راضی ہو۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾﴾(الانعام)

''(اے نبی!) کہہ دیجیے میری نماز' میری قربانی' میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے''۔

پانچواں تقاضا: رضائے ربّ پر راضی رہنا

قرآن مجید کا ہر جملہ معانی کا گنجینہ ہے۔ ہمارا کوئی رشتہ دار یا عزیز یا کوئی بھی مسلمان بھائی فوت ہو جائے تو ہم کہتے ہیں: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ اس آیت میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی گئی ہے' اور وہ یہ کہ ہم' ہمارے اعزہ واقارب اور تمام لوگ سب اللہ کے لیے ہیں۔ ہم سب کو کشاں کشاں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ جب سب اللہ کے لیے ہیں تو کسی کی وفات پر اللہ سے گلے شکوے کیوں کیے جائیں؟ عام طور پر انسان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے' اور جب کوئی بیٹا یا بیٹی فوت ہو جائے تو خیال کرتا ہے کہ میں اپنی چیز سے محروم ہو گیا ہوں' لہٰذا روتا اور چیختا ہے۔ بعض اوقات غم واندوہ کی آندھیاں اس طور سے اس کے دل کی بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں کہ وہ اپنے عزیز کی محبت میں اپنی زندگی کا چراغ ہی گل کر دیتا ہے۔ لیکن اگر انسان کا اس بات پر پختہ یقین ہو کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہم سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے' جو کچھ بھی مجھے ملا ہے وہ عطیہ ہے' میرے پاس جو چیز بھی ہے اللہ کی امانت ہے' لہٰذا اگر وہ مجھ سے اسے لے لے تو یہ اُسی مالک کی مرضی ہے' میں رضائے رب پہ راضی ہوں' تو ایسا شخص مال واولاد کے چھن جانے پر صبر کرتا ہے۔ اسے مستقبل کی بھی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ کل کیا ہوگا' کیونکہ وہ اس یقین سے سرشار ہوتا ہے کہ اللہ جو میرا اور پوری کائنات کا ربّ ہے' حکیم ودانا ذات ہے' وہ مجھ سے بڑھ کر میرے مفاد کا محافظ ہے۔ لہٰذا اس کا ہر فیصلہ مجھے قبول ہے۔ اور یہی بندگی کا تقاضا ہے۔

چھٹا تقاضا: ربّ سے براہِ راست تعلق استوار کرنا

ربّ کریم چاہتا ہے کہ اس کا ہر بندہ اُس سے ذاتی تعلق استوار کرے اور اسے مضبوط بنائے۔ اللہ سے ذاتی تعلق کو پیش نظر نہ رکھنے کا ایک منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کے تحت الشعور میں یہ غلط فہمی اپنی جگہ بنا لیتی ہے کہ اللہ تو اصل میں مولویوں' پیروں' پنڈتوں' پادریوں

اور ربیوں کا ہے' لہٰذا ہمیں اس کے حضور درخواست پیش کرنے کے لیے لازماً ان لوگوں کا سہارا لینا ہوگا۔ اس کے برعکس اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حاکم و محکوم' خواص و عوام' بڑوں اور چھوٹوں' مردوں اور عورتوں' زمینداروں اور کاشت کاروں' سرمایہ کاروں اور مزدوروں' گوروں اور کالوں' غرض یکساں طور پر تمام انسانوں کا ''ربّ'' ہے اور اپنے ربّ سے ان کا یہ تعلق بلاواسطہ ہے' لہٰذا ربّ کا منشاء یہ ہے کہ انسان ہر حال میں اسے براہِ راست پکارے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ......﴾ (البقرۃ:١٨٦)

''اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں' جب بھی کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں......''

اسی حقیقت کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے : ؎

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے؟
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

ساتواں تقاضا: ربّ کی پناہ میں آنا

قرآن مجید کی نازل ہونے والی پہلی آیت اور قرآن کے متن (text) کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو بطور ''ربّ'' متعارف کروایا گیا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان انتہائی کمزور ہے' خود کو اللہ کی طاقتور مخلوق کی کھلی اور مخفی کارروائیوں کے سامنے بے بس پاتا ہے' لہٰذا قرآن مجید کے اختتام پر دو سورتوں میں ہر قسم کے کھلے اور مخفی خطرات سے محفوظ ہونے کے لیے اپنے ''ربّ'' ہی کی پناہ طلب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

کچھ بیرونی خطرات ہوتے ہیں جو انسان کو پریشان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی جادو نہ کر دے' کوئی جسمانی یا مالی نقصان سے دوچار نہ کر دے۔ ان خطرات سے بچنے کے لیے سورۃ الفلق کا ورد کیا جائے تو ان شاء اللہ خوف اور اندیشہ دور ہو جائے گا۔

﴿قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾ وَمِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ۙ﴿۴﴾ وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾﴾

''کہو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں' ہر چیز کی بدی سے جو اُس نے بنائی' اورشب تاریک کی برائی سے جب اس کا اندھیرا چھا جائے' اور گنڈوں پر (پڑھ پڑھ کر) پھونکنے والیوں کی برائی سے' اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب وہ حسد کرنے لگے۔''

دوسری طرف کچھ خطرات اندرونی ہیں جونفس اور شیاطین جن و انس کی طرف سے ہیں۔ بدی کی یہ قوتیں دل کو برائی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اگر انسان کو احساس ہو کہ اس نے بڑی ریاضتیں کی ہیں لیکن برائی دور نہیں ہوئی اور اس میں پڑنے کا اندیشہ ہے تو سورۃ الناس کا ورد کرے:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ اِلٰهِ النَّاسِ ۝۳ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۵ الْخَنَّاسِ ۝۴ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝۶﴾

''کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں' (یعنی) لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی۔ لوگوں کے معبود برحق کی۔ (شیطان) وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ (خواہ وہ) جنات میں سے (ہو) یا انسانوں میں سے۔''

علاوہ ازیں جب بھی شیطان چونکائے تو بھی حکم ہے کہ ہم اپنے ربّ کی طرف لپکیں۔ ﴿وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ (الاعراف:۲۰۰' حٰمٓ السجدۃ:۳۶) کیونکہ ربّ الناس کی پناہ میں ہی ہم مامون و محفوظ ہو سکتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ربّ کی معرفت اور خود شناسی ہی قرآن مجید کا بنیادی پیغام ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ربّ کی بندگی اور اس کی رضا کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آخر میں آپ سے میں صرف یہ گزارش کرتا ہوں کہ آج رات تنہائی میں بیٹھ کر اپنے اللہ سے لو لگائیے اور دل کی گہرائی سے دو جملے ضرور کہیے: ''اے اللہ تو میرا ربّ ہے' میں تیرا بندہ ہوں'' اور پھر لذت و سرور کا بے نظیر تجربہ کیجیے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ OO

تصوّرِ عدل

قرآن وسنت کی روشنی میں

عتیق الرحمٰن صدیقی

العدالۃُ و المعادَلَۃُ کے لفظ میں مساوات کے معنی پائے جاتے ہیں اور معنیٔ اضافی کے اعتبار سے استعمال ہوتا ہے' یعنی ایک دوسرے کے ہم وزن اور برابر ہونا۔ اور عَدلٌ وعِدلٌ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں' لیکن عَدلٌ کا لفظ معنوی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے' جیسے احکامِ شرعیہ۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿اَوْ عَدْلُ ذٰلِکَ صِیَامًا﴾ (المائدۃ:۹۵) ''یا اس کے برابر روزے رکھنا''۔ اور عِدلٌ وعَدِیلٌ کے الفاظ ان چیزوں کے لیے بولے جاتے ہیں جن کا ادراک حواسِ ظاہرہ سے ہوتا ہے' جیسے وہ چیزیں جن کا تعلق ماپ' تول یا وزن سے ہوتا ہے۔ پس عدلٌ کے معنی ''دو چیزوں کا برابر ہونا'' کے ہیں۔ چنانچہ اسی معنی میں مروی ہے: **بالعدل قامت السمٰوات والارض** کہ ''عدل ہی سے آسمان وزمین قائم ہیں''۔ یعنی اگر عناصر اربعہ' جن سے کائنات نے ترکیب پائی ہے' میں سے ایک عنصر میں بھی اس کی معیّنہ مقدار سے کمی یا بیشی ہو جائے تو نظامِ کائنات قائم نہیں رہ سکتا۔ (مفردات القرآن' اردو' جلد دوم)

ہم جب کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیں کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی بیشی نہ رہے تو عربی میں اس کو عدل کہیں گے۔ اسی مناسبت سے لوگوں کے نزاعی امور میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کو عدل کہا جائے گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم جو بات کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی ایک طرف جھکنے نہ پائے۔ اس لحاظ سے افراط وتفریط کے درمیان اعتدال کو بھی عدل کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک نام ''**العَدل**'' بھی ہے' یعنی اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے' وہ حق بات کہتا ہے اور وہی کرتا ہے جو حق ہے۔ دنیا کا یہ کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہوا ہے' عدل و انصاف کے بل بوتے پر ہی قائم ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ (آل عمران:۱۸)

''اللہ تعالیٰ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے، وہی (اللہ تعالیٰ) انصاف کو لے کر کھڑا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کے ساتھ عدل کرے، اپنے نفس اور اپنے ربّ کے درمیان عدل کرے اور تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے اور جب دو فریق اس کے پاس اپنا کوئی معاملہ محاکمے کے لیے لائیں تو حق کے مطابق فیصلہ کرے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ......﴾ (النحل:۹۰)

''بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے (ہر معاملہ میں) انصاف کا اور (ہر ایک کے ساتھ) بھلائی کا......''

عدل اپنے تمام مشتقات کے ساتھ قرآن مجید میں اٹھائیس بار استعمال ہوا ہے۔ یہ قانون کا اقتضاء ہے، اور احسان کرنا اور درگزر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت میں عالَم کے نظم و انصرام کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے عدل کا حکم صادر فرمایا اور پھر احسان کی تاکید فرمائی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے عدل و انصاف اور احسان کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

''عدل کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو، دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقہ سے دیا جائے۔ اردو زبان میں اس مفہوم کو لفظ ''انصاف'' سے ادا کیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے، اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو...... دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن اور تناسب ہے نہ کہ برابری ...... پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ حقوق میں مساوات نہیں بلکہ توازن اور تناسب ہے اور اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں''۔

''احسان سے مراد ہے نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی،

درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس ولحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا، یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے، عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے''۔

(تفہیم القرآن، جلد دوم، تفسیر سورۃ النحل)

قرآن حکیم نے زندگی کے تمام شعبوں میں عدل وانصاف سے کام لینے کا حکم دیا ہے۔ اسلامی تہذیب وتمدن کو وجود میں لانے اور ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ تشکیل دینے کے لیے حسن معاشرت کے تقاضوں کی تکمیل ضروری ہے اور یہ عدل کو بروئے کار لائے بغیر ممکن نہیں، چنانچہ تعدّدِ ازواج کے جواز کو عدل کی شرط سے مشروط کیا گیا تا کہ عورتوں کو ظلم وجور سے محفوظ رکھا جا سکے۔ فرمایا:

﴿فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ‌ؕ ذٰلِكَ اَدۡنٰٓى اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؀۳﴾ (النساء)

''لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا اُن عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں، بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرین صواب ہے''۔

یتیموں کے حقوق کے بارے میں فرمایا:

﴿وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡيَتٰمٰى بِالۡقِسۡطِ‌ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيۡمًا ؀۱۲۷﴾ (النساء)

''اور (اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ) یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو۔ اور جو بھلائی تم کرو گے اسے اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے''۔

عام معاملات میں عدل وانصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزمرّہ کی خرید وفروخت میں وزن و پیمانہ میں ہوتی ہے، ان پیمانوں میں ڈنڈی مارنے سے بگاڑ اور فساد جنم لیتا ہے۔ قرآن نے کئی جگہ ناپ تول میں کمی کرنے کی سخت مذمت اور صحیح ناپنے اور تولنے کی بہت تاکید کی ہے۔ سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿وَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَالۡمِيۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ‌ۚ﴾ (آیت ۱۵۲)

''اورانصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو''۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا:

﴿وَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ اِذَا كِلۡتُمۡ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ﴾ (آیت ۳۵)

''اور جب ناپو تو پورا ناپو اور صحیح ترازو سے تولو''۔

سورۃ الرحمٰن میں تاکید کی گئی کہ:

﴿اَلَّا تَطۡغَوۡا فِى الۡمِيۡزَانِ ۝٨ وَاَقِيۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِيۡزَانَ ۝٩﴾

''یہ کہ تولنے میں زیادتی نہ کرو۔ اور ٹھیک انصاف کے ساتھ وزن کرو اور ترازو میں گھاٹا نہ دو۔''

انسان ایک مدنی الطبع مخلوق ہے' وہ انفرادی زندگی رکھتا ہے مگر فطرتاً اس کا مزاج معاشرتی ہے' وہ جہاں بھی پایا جاتا ہے کسی خاندان کے رکن اور معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت میں پایا جاتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں طرح طرح کے تنازعات رونما ہوتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے تمام نزاعی امور میں اللہ ورسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن کریم اسلامی ریاست پر لازم قرار دیتا ہے کہ اس کے تمام فیصلے بذریعہ عدالتی حکم نافذ ہوں۔ اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھا ہے۔ تحریری دستاویز مرتب کرنے والے کو انصاف کے ساتھ لکھنے کی ہدایت کی گئی' جبکہ شہادت دیتے وقت یا فیصلہ کے وقت اپنے ایمان پر مضبوط رہنے کی تلقین کی گئی۔ فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ‌ۖ وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا‌ ؕ اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى‌ ﴾ (المائدۃ:۸)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے (اور) انصاف کی گواہی دینے والے بنو' اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ' عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔''

سورۃ الانعام میں کہا:

﴿وَاِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا وَلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبٰى‌ ﴾ (آیت ۱۵۲)

''اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو''۔

سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۱۳۵﴾﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ اس (تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی) کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو' فریق معاملہ خواہ مال دار ہو یا غریب' اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے' لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے''۔

گویا ایک نہایت ہی کٹھن اور دشوار گزار منزل میں بھی نہایت صراحت کے ساتھ فرما دیا گیا کہ عدل وانصاف کے فیصلے اور گواہی میں نہ تو تمہاری ذات تمہیں الجھائے اور نہ عزیز واقارب' اور نہ ہی زر و سیم کی کھنک تمہیں حق وانصاف کی بات کرنے سے روکے' نہ کسی غریب کی غربت تمہیں ترس کھانے پر آمادہ کرے اور نہ کسی کی بزرگی اور بڑائی تمہیں مرعوب کرے۔ عدل و انصاف کی راہ میں کوئی بھی پتھر تمہارا سدِ راہ نہ بنے' جو بات کہو خدا لگتی کہو اور اللہ کی رضا کے لیے کہو اور تمہارا مقصد صرف عدل وانصاف کی حمایت ہو۔

حاکموں کو رشوت دے کر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کو نہایت ناپسندیدہ اور مبغوض عمل قرار دیا گیا ہے' اس طرح ان کی رائے کو متاثر کرنے کو رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں گناہ قرار دیا گیا ہے:

﴿وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾﴾ (البقرۃ)

''اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔''

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی فیصلہ ہے' اس لیے اس میں بھی عدل وانصاف کا حکم دیا گیا ہے' فرمایا:

﴿......فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ﴿۹﴾﴾ (الحُجُرٰت)

''......پس دونوں میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کو ملحوظ رکھو' بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔''

قرآن نے حاکم کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ عادل ہو:

﴿وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۵۸﴾﴾ (النساء)

''اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔ یقیناً اللہ تم کو اس کی نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے''۔

اس آیۂ کریمہ کے پہلے جملے میں فرمایا گیا کہ ذمہ داریاں ان لوگوں کے سپرد کرو جو منصبِ شہادت پر متمکن ہونے کی صلاحیتوں سے بہرہ مند ہوں۔ مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

''وہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کو عدل و انصاف کے ساتھ چکائیں۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں امیر وغریب' شریف و وضیع' کالے اور گورے کا کوئی فرق نہ ہو' انصاف خریدنی وفروختنی چیز نہ بننے پائے' اس میں کسی جنبہ داری' کسی عصبیت' کسی سہل انگاری کو راہ نہ مل سکے' کسی دباؤ' کسی زور واثر اور کسی خوف وطمع کو اس پر اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔ جن کو بھی اللہ تعالیٰ اس زمین میں اقتدار بخشتا ہے اسی عدل کے لیے بخشتا ہے' اس وجہ سے سب سے بڑی ذمہ داری اسی چیز کے لیے ہے۔ خدا کے ہاں عادل حکمران کا اجر بھی بہت بڑا ہے اور غیر عادل کی سزا بھی بہت سخت ہے''۔ (تدبر قرآن' جلد دوم)

مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ: ''اس آیت پاک میں ''امانت'' سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وہ منصفانہ حق ہے جو ایک کا دوسرے پر چاہیے......اور یہ فیصلہ دوست و دشمن' کافر و مسلم سب کے ساتھ یکساں عدل وانصاف کے ساتھ ہونا چاہیے۔ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کے معاملات میں حکم ہوا: ﴿وَاِنۡ حَکَمۡتَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ

الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ (المائدة) ''اور اگر (اے نبیؐ!) فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔ (سیرت النبیؐ جلد ششم)

آپؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو' اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو' قوتِ نطق سے محروم نہ ہو' صاحب علم ہو''۔ فقہاء نے بھی قاضی کی جو صفات بیان کی ہیں ان میں اس کا مسلمان ہونا' عاقل و بالغ ہونا' آزاد ہونا' عادل ہونا' اس کا مجتہد ہونا اور سمع و بصر اور زبان کی سلامتی سے ہمکنار ہونا ضروری قرار دیا ہے۔

عدل و انصاف کے ضمن میں قرآنی تعلیمات کی تصریح کے بعد اب ہم سنت نبویؐ کے تناظر میں مذکورہ موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ ہم جب رسول اللہ ﷺ کے خصائص اور اوصاف پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ کی ہر خصوصیت درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپؐ نے جس معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں پورے تیئیس برس صرف کر دیے اس معاشرے کا ہر فرد عدل و انصاف کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ نبی کریم ﷺ نے نہ صرف ان کے حقوق میں توازن قائم کیا بلکہ تزکیہ و تربیت کے مسلسل عمل سے ان میں اس وصف کو پختہ کر دیا کہ وہ بلاکم و کاست ایک دوسرے کے حقوق حسن و خوبی سے ادا کریں۔ آپؐ کی پیغمبرانہ زندگی کا یہ ایک زرین عنوان ہے کہ جو کچھ زبانِ مبارک سے کہا وہ کچھ کیا اور جو کچھ خود کیا اس کی نصیحت اور تلقین کی۔ رسول اللہ ﷺ کے مکارمِ اخلاق کے بارے میں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے استفسار کیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ''آپؐ کا اخلاق قرآن تھا''۔

حضور نبی کریم ﷺ کا واسطہ سینکڑوں قبائل سے تھا' انہیں نہایت ہی پیچیدہ اور نازک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا' مگر آپ ﷺ نے کسی موقع پر بھی عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ قریش کے ایک معزز خاندان مخزوم سے ایک خاتون چوری کے جرم میں گرفتار کر کے لائی گئی' قریش کی عزت کے لحاظ سے ان کی خواہش تھی کہ یہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کو بیٹوں کی طرح عزیز اور محبوب تھے' ان کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے سفارش کرائی گئی' آپؐ کا چہرہ دفعتاً سرخ ہو گیا اور آپؐ نے غضب ناک ہو کر فرمایا: ''بنی اسرائیل اس لیے تباہ ہوئے کہ وہ امراء سے درگزر کرتے تھے اور غرباء کو سزا دیتے تھے' خدا کی قسم اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا''۔ (صحیح بخاری)

خیبر کے یہودیوں سے جب صلح ہوگئی اور وہاں کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تو ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کھجوروں کی بٹائی کے لیے گئے تو انہیں قتل کر دیا گیا اور ان کی لاش گڑھے میں ڈال دی گئی۔ ان کے چچیرے بھائی محیصہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس استغاثہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے انہیں قتل کیا ہے؟'' بولے ''میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا''۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو یہود سے حلف لیا جائے''۔ بولے: ''حضورؐ! یہودیوں کی قسم کا کیا اعتبار! یہ سو دفعہ قسم کھا لیں گے''۔ خیبر میں صرف یہودی قوم ہی آباد تھی مگر کوئی عینی شہادت موجود نہ ہونے کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تعرض نہ کیا اور خون بہا کے سو اونٹ بیت المال سے دلوائے۔ (بخاری ونسائی)

مشہور واقعہ ہے کہ ایک یہودی اور ایک منافق مسلمان آپس میں کسی معاملہ میں جھگڑ پڑے' دونوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور قصہ بیان کیا' آپؐ نے دلائل سننے کے بعد یہودی کے حق میں فیصلہ دیا۔ باہر نکلے تو منافق نے کہا کہ مجھے یہ فیصلہ منظور نہیں ہے' چلو عمر فاروقؓ کے پاس چلتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دلائل سنے اور آپؓ کو معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہودی کے حق میں فیصلہ دے چکے ہیں تو انہوں نے منافق کو قتل کر دیا' فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ سنا دیا ہے تو انؐ کے فیصلہ کے بعد کسی کی کیا مجال ہے کہ دم مار سکے! اللہ تعالیٰ نے اس کی تائید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل وانصاف کو معیار قرار دیا اور فرمایا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾﴾ (النساء)

''پس نہیں (اے محمدؐ!) تمہارے ربّ کی قسم! یہ کبھی مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور سر بسر تسلیم کریں''۔

اس بات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبِعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس طریقہ کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں''۔ (مشکوٰۃ' بحوالہ شرح السنّہ)

ایک بار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے' خاصا ہجوم تھا' اس اثناء میں ایک

شخص منہ کے بل آپؐ پر لد گیا' اُس وقت آپؐ کے دست مبارک میں ایک پتلی سی لکڑی تھی۔ آپؐ نے اس سے اس کو ٹھوکا دیا' اتفاق سے لکڑی کا سرا اُس کے منہ پر لگ گیا اور خراش آ گئی۔ فرمایا: ''مجھ سے انتقام لے لو''۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں نے معاف کر دیا۔ (بحوالہ سیرت النبی ﷺ' از شبلی نعمانی) وفات سے پہلے نبی کریم ﷺ نے مجمع عام میں ہی اعلان فرمایا کہ اگر ان کے ذمہ کسی کا قرض آتا ہو' کسی کی جان و مال یا آبرو کو صدمہ پہنچا ہو تو ان کی جان اور آبرو حاضر ہے' اسی دنیا میں وہ انتقام لے لے۔ مجمع پر ایک سناٹا طاری رہا۔ صرف ایک شخص نے چند درہم کا دعویٰ کیا جو اُسے دلوا دیے گئے۔

آیاتِ قرآنیہ اور اُسوۂ رسول سے واضح ہوا کہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہیے' مگر حاکمِ وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''قیامت کے دن جب کہ اللہ تعالیٰ کے سائے کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہو گا' سات شخصوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں لے گا' جن میں ایک شخص امام عادل ہو گا''۔ (بخاری)

عدلیہ کا منصب انتہائی خطرناک ہے' ایک جج بہت بڑی آزمائش سے دوچار ہوتا ہے' رشوت اور سفارش کی سحر آگیں آلودگیوں سے دامن عفت کو محفوظ رکھ کر حق وانصاف کا بول بالا کرنا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے جسے جج بنایا گیا گویا اسے چھری کے بغیر ذبح کیا گیا''۔ (ابوداؤد) آپ ﷺ نے فرمایا: ''منصف جب تک ظلم نہ کرے اللہ تعالیٰ (کی رحمت اور توفیق) اس کے ساتھ ہے' اور جب وہ کسی کی حق تلفی کا فیصلہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے چھوڑ دیتا ہے اور شیطان اس سے چمٹ جاتا ہے''۔ (ترمذی)

اسلامی نظامِ عدل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عدالت صرف ایک فریق کی بات سن کر فیصلہ نہ دے بلکہ دوسرے فریق کی بات بھی توجہ سے سنے' مدعی اور مدعا علیہ کو اپنے اپنے موقف کی وضاحت کا پورا موقع فراہم کرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے جج کے عہدے پر یمن جانے کا حکم دیا تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ مجھے وہاں جانے کا حکم دیتے ہیں' حالانکہ میں (ناتجربہ کار) نوجوان ہوں اور قضا کو بھی نہیں جانتا (میں کس طرح فیصلے کروں گا)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تیرے دل کو ہدایت دے اور تیری زبان کو پختہ کرے' جب دو آدمی فیصلہ کرانے کے لیے تیرے سامنے

بیٹھیں تو پہلے آدمی کی بات سن کر اس کے حق میں فیصلہ نہ کر یہاں تک کہ تو دوسرے آدمی کی بات سن لے۔ فیصلہ معلوم کرنے کے لیے یہ طریقہ سب سے زیادہ موزوں ہے''۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: اس کے بعد مجھے فیصلہ کرنے میں پھر کبھی الجھن نہیں ہوئی۔ (ابوداؤد' کتاب القضاء)

عدلیہ کا دوسرا بڑا اہم اصول یہ ہے کہ جج کو غصہ کی حالت میں فیصلہ نہیں لکھنا چاہیے' کیونکہ جب طبیعت میں ٹھہراؤ نہ ہو اور ایک ہیجان کی سی کیفیت ہو تو صحیح فیصلے پر پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ ''حاکم غصہ کی حالت میں دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے''۔ (بخاری)

ایک جج مقدمہ کے مواد' دلائل اور گواہوں کے بیانات کو مدنظر رکھ کر فیصلہ صادر کرتا ہے' عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی چرب زبانی اور فصاحت لسانی کے باعث جج کو کسی مغالطہ میں مبتلا کر دے' مگر جج کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں بشر ہوں' تم اپنے جھگڑوں کے فیصلہ کے لیے میرے پاس آتے ہو' ہوسکتا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ دوسرے فریق کے مقابلہ میں اپنی دلیل کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں' لہٰذا دلائل سننے کے بعد میں ایک فریق کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ میں (اس طرح غلط فہمی کی وجہ سے) ایک شخص کو دوسرے کے مال کا مالک بنا دوں (حالانکہ اس شخص کا اس کے مال پر کوئی حق نہیں تھا اور وہ صرف میرے فیصلہ کی وجہ سے اس کے قبضے میں آ رہا ہے) تو وہ نہ لے۔ بے شک میں آگ سے ایک ٹکڑا کاٹ کر اسے دے رہا ہوں''۔ (بخاری' کتاب الاحکام)

مجرم کی سفارش بہت بڑا گناہ ہے' بعض بااثر اور مال دار لوگوں کی سفارش اور مداخلت سے حقیقی مجرم سزا سے بچ جاتے ہیں اور بے گناہ لوگ گرفت میں آ جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ ''جس شخص کی سفارش اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں میں سے کسی حد کو مجرم پر نافذ نہ ہونے دے وہ اللہ کے حکم کا مخالف ہے اور جس نے کسی کے ساتھ ناحق جھگڑا کیا' حالانکہ وہ اسے ناحق جانتا ہے' وہ ہمیشہ اللہ کے غصے کی زد میں رہے گا یہاں تک کہ وہ اس سے رُک جائے۔ جس نے مؤمن کی طرف ایک ایسی برائی منسوب کی جو اُس میں نہیں پائی جاتی تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخیوں کی پیپ کی کیچڑ میں ٹھہرائے گا'

یہاں تک کہ وہ اس کی سزا بھگتنے کے بعد ہی اس سے باہر آئے گا‘‘۔(ابوداوٗد‘ کتاب القضاء)

اسلام کے نظامِ عدل میں اسلامی ریاست کا صدر اور عام شہری برابر ہیں۔حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کر کے عملاً اس کی توثیق کی ہے۔ہم اوپر کی سطور میں وفات سے پہلے مجمع عام میں آپؐ کے ایسے ہی اعلان کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ہم یہاں اس حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

> ابوخراس کہتا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں ہم سے فرمایا:’’میں نے اپنے گورنروں کو اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ تمہاری پٹائی کریں اور ناحق تم سے مال وصول کریں‘ اس سلسلہ میں جس آدمی کو کوئی شکایت ہو وہ میرے پاس آئے میں اس سے قصاص دلواؤں گا‘‘۔(مصر کے گورنر) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر کوئی حاکم تہذیب سکھانے کی غرض سے کسی آدمی کو سزا دے تو کیا آپ اس سے بھی بدلہ دلوائیں گے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا:’’ہاں‘ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری زندگی ہے‘ میں اسے بدلہ دلاؤں گا‘ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آنجنابؐ نے اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کر دیا‘‘۔(ابوداوٗد)

اخذ واستفادہ:

☆ تفہیم القرآن‘ جلد اول‘ دوم‘ ہشتم۔

☆ تدبر قرآن‘ از مولانا امین احسن اصلاحی۔

☆ سیرت النبی ﷺ‘ از شبلی نعمانی‘ جلد دوم و ششم۔

☆ مفردات القرآن‘ جلد دوم۔

☆ اسلامی نظامِ حکومت میں عدلیہ کا مقام‘ از سید معروف شیرازی۔

☆ ترجمان الحدیث‘ حصہ اوّل‘ از سید محمود حسن۔

1

صوفی اور مجاہد

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عرفِ عام میں صوفی ان نیک نہاد' تقویٰ شعار' عبادت گزار اور گوشہ گیر مسلمانوں کو کہا جاتا ہے جو دنیا کے ساتھ واجبی سا تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کا زیادہ وقت صوم وصلوٰۃ اور ذکرو اذکار میں گزرتا ہے۔ دنیا کے دھندوں اور جھمیلوں سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اُن کو ملک کے سیاسی' معاشی' معاشرتی اور عدالتی نظام سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ اقتدار کی ہوس سے کلیتًا پاک ہوتے ہیں۔ اُن کو کوئی غرض نہیں ہوتی کہ دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں۔ وہ پورے تحفظات کے ساتھ امر بالمعروف کی اہمیت تو جانتے ہیں' لیکن نہی عن المنکر اُن کے پروگرام میں شامل نہیں ہوتا۔ بے نمازوں' بے دینوں اور ظالموں کے وجود کو وہ برداشت کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر حاکمِ وقت شریعت کا نفاذ نہیں کرتا بلکہ خلافِ شریعت آرڈیننس نافذ کرتا ہے تو ان کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں پڑتی۔ وہ اس بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ ان کی نماز' روزے اور ذکرواذکار میں کوئی مزاحمت نہ ہو اور اسی کو وہ اپنا وظیفۂ حیات سمجھتے ہیں۔ انہی کی ترجمانی علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے: ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

ایسے لوگوں کو قیامِ پاکستان کی تحریک سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری نماز' روزے اور مذہبی رسومات میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں تو ہم نے علیحدہ ملک کیوں لینا ہے' حالانکہ برعظیم پاک و ہند پر انگریزوں کی حکومت تھی اور ان کا بنایا ہوا قانون نافذ تھا۔ مسلمان غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ مسلمان دنیا میں محض نماز' روزے اور ذکرواذکار کے لیے نہیں آیا' بلکہ اس کی ذمہ داری ہے کہ کفر کو مٹانے کی جدوجہد کرے' اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون نافذ کرے' اور اس کام میں جس طرح کی قربانی دینا پڑے اس سے دریغ

نہ کرے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد دین حق کا اظہار تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد وہی ہونا چاہیے جو آپؐ کی زندگی کا تھا‘ یعنی دین حق کے غلبے کی کوشش۔ اس سلسلے میں آپؐ کی شب و روز کی جدوجہد ہمارے سامنے ہے اور وہی اسوۂ حسنہ ہے جس کی پیروی کا ہر مسلمان کو حکم دیا گیا ہے۔ بقول اقبال: ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

اپنے نماز روزے کو کافی سمجھنا مسلمان کے لیے بہت بڑا مغالطہ اور فریب ہے۔ سب سے اچھے افرادِ اُمت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ ان کی زندگیاں اُسوۂ حسنہ کے قریب تر تھیں‘ وہ دن کے شاہ سوار اور رات کے عبادت گزار تھے۔ وہ کنج عزلت میں بیٹھ کر‘ ماحول سے کٹ کر زندگی نہیں گزارتے تھے‘ بلکہ ان کی زندگی تو سراسر جدوجہد اور مشقت سے بھرپور تھی۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کی تعلیمات کے مطابق کفر کو مٹانے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کیا اور نہ کبھی کفر اور طاغوت سے مصالحت کی۔ رسول اللہ ﷺ کا طرزِ زندگی اُن کے سامنے تھا۔ پھر وہ اِس فرمانِ نبویؐ سے بھی واقف تھے:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ ‘ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ‘ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ ‘ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ))(۱)

’’تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روک دے‘ اور اگر اتنی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے روکے‘ اگر اتنی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے اسے بُرا جانے‘ اور یہ کمزورترین ایمان ہے‘‘۔

ظاہر ہے کمزورترین ایمان مطلوب نہیں بلکہ ایمانِ کامل مطلوب ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمان برائی کو مٹانے کے لیے اپنی صلاحیتوں اور اختیار کو پورے طور پر کام میں لائے۔ اسلام میں ترکِ دنیا اور رہبانیت نہیں ہے۔ یہاں تو نکاح کرنا مسنون عبادت ہے‘ بیوی بچوں کی ضروریات پوری کرنا عبادت ہے۔ معاشرے سے کٹ کر زندگی بسر کرنے کا تو اسلام میں کوئی تصور نہیں۔

وحیٔ نبوت سے قبل رسول اللہ ﷺ ایک اچھے انسان کی زندگی گزار رہے تھے۔ مکہ کے

---

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب کون النھی عن المنکر من الایمان......

کفر و شرک اور برائی کے ماحول سے آپؐ کو نفرت تھی۔ آپؐ ارد گرد کی ان غلاظتوں اور نجاستوں سے بے زار تھے۔ چنانچہ آپؐ کئی کئی دنوں کے لیے غارِ حرا میں گوشہ گیر ہو جاتے اور وہاں ذکر و فکر میں مشغول رہتے۔ آپؐ کو صراطِ مستقیم کی تلاش تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو راہِ راست دکھائی۔ نزولِ وحی کے ساتھ آپؐ کو مقصدِ بعثت سے آگاہ کر دیا گیا کہ اب آپ بنی نوعِ انسان کو سیدھی راہ دکھائیں جو انہیں حقیقی کامیابی کے ساتھ ہمکنار کرے گی۔ چنانچہ آپؐ نبوت کا تحفہ لے کر غارِ حرا سے اُترے اور اپنے مشن میں لگ گئے۔ اس کام میں آپؐ اتنے مصروف ہو گئے کہ باقی زندگی میں پھر کبھی غارِ حرا کی زیارت کے لیے تشریف نہیں لے گئے۔ کیونکہ آپؐ کو اپنی ڈیوٹی سے آگاہ کر دیا گیا تھا اور آپؐ اپنے فرض سے ایک لمحے کے لیے بھی بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ بڑا ہی بے ذوق محقق ہے جو غارِ حرا میں آپؐ کی خلوت گزینی سے صوفیانہ چلہ کشی کا جواز پیدا کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ ضرور کئی کئی دن بھوکے پیاسے رہ کر غاروں اور جنگلوں میں تپسیائیں کرتے۔ مگر اسلام میں ایسا نہیں اور نہ ہی صحابہؓ نے ایسا کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فریضۂ رسالت ادا کرتے ہوئے اللہ کا پیغام مکہ کے لوگوں تک پہنچایا۔ حد درجہ مخالفت کی گئی' اذیتیں دی گئیں' لالچ دیے گئے' مگر آپؐ اپنے کام میں لگے رہے۔ چند لوگوں نے آپؐ کی آواز پر لبیک کہا تو وہ بھی ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنائے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مکہ مکرمہ کی سرزمین آپؐ پر اور آپؐ کے صحابہ پر تنگ کر دی گئی۔ آپؐ کے چند ساتھی اور خود آپؐ مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ وہاں پھر آپؐ پورے جوش و جذبے کے ساتھ اپنے فریضۂ منصبی میں لگ گئے۔ مخالفت ہوئی' کفر و نفاق کے ساتھ مڈبھیڑ کا آغاز ہوا' مسلح جنگیں ہوئیں' قیمتی جانوں کی قربانی دینا پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرزمین حجاز میں دین اسلام کا غلبہ ہو گیا اور کفر کے لیے سرزمینِ حرم میں بقاء ممکن نہ رہی۔ آپؐ جہانِ فانی سے حیاتِ ابدی کی طرف رخصت ہوئے اور اُمت کو پورے عالم میں اللہ کی حاکمیت کے نظام کے نفاذ کی ذمہ داری سونپ گئے۔ آپؐ کی وفات کے بعد خلافت راشدہ قائم ہوئی جس میں اقصائے عالم میں دین اسلام غالب ہو گیا اور کفر و شرک کو چھوٹا بن کر رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔

خیر القرون کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں میں کمزوری آئی اور عجمی خیالات نے اسلامی تعلیمات میں دراندازی کی تو کئی طرح کے افکار و نظریات اور فلسفے ظہور پذیر ہوئے' اُن میں

ایک معروف طرزِ حیات صوفی ازم تھا۔ جیسا کہ آغاز میں بیان ہوا' اس میں نماز روزے کی پابندی کو کافی سمجھا گیا' باطن کی صفائی اور کردار کی خوبی میں دین کو محصور کر دیا گیا' جبکہ اسلامی تعلیمات کی روح کو فراموش کر دیا گیا۔ بقول اقبال: ؎

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

سورۃ المائدۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۰۵)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا' تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جبکہ تم ہوئے راہ پر''۔

اس آیت سے بعض صحابہؓ کو غلط فہمی ہوئی کہ انسان پر بس اپنی ذمہ داری ہے' جب وہ خود نیکی پر ہے تو دوسروں کی بدعملی کا اس سے مؤاخذہ نہیں۔ اُس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی اس غلط فہمی کو یہ کہہ کر دور کر دیا تھا کہ بدکرداروں کو پوری قوت اور استطاعت کے ساتھ راہِ صواب بتا دینے کے باوجود بھی اگر وہ برائی پر عمل پیرا رہتے ہیں تو اُن کی برائی کی ذمہ داری ان نیکوکاروں پر نہ ہوگی۔ جبکہ اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جب تم نیک اعمال کر رہے ہو تو اردگرد کی برائیوں کو روکنے کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ مگر آج بھی یہ غلط فہمی پیدا کر کے جہادی طرزِ عمل سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اپنے نماز روزوں کو کافی سمجھا جا رہا ہے' اور لاکھوں مسلمان ہیں جو اس غلط فہمی کی آڑ میں نہی عن المنکر کے فریضے سے غافل ہیں اور کفر اور شرک کے ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ہاں پورے اخلاص اور خلوص سے ربّ العزت سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ برائی مٹ جائے اور اسلام کا غلبہ ہو جائے اور یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مانگا کرتے تھے' مگر اُس وقت جب عملی طور پر کفر کی بیخ کنی کرتے اور اسلام کے غلبے کے لیے بھرپور جدوجہد بھی کرتے تھے۔ آپؐ کے صحابہ کرام دل وجان اور مال ومنال کے ساتھ آپؐ کے ہمراہ ہوتے تھے۔ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جو دن کو جہاد

کرتے تھے اور رات کو اللہ کے حضور کھڑے ہو کر دعائیں مانگتے تھے' کیونکہ وہ اپنے فرض سے بخوبی آگاہ تھے۔ نبی اکرم ﷺ کا اُسوۂ حسنہ بھی اُن کے سامنے تھا اور آپ کا وہ فرمان بھی جس میں آپؐ نے نہی عن المنکر کے تین درجے واضح فرما دیے۔ پھر آپؐ کا وہ فرمان بھی ان کے پیش نظر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو اس کی پوری آبادی کے ساتھ اُلٹ دو۔ جبریلؑ نے عرض کیا اے پروردگار! اس بستی میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے کے برابر بھی کبھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ اس بستی کو اس بندے پر اور اس کے دوسرے سب باشندوں پر اُلٹ دو' کیونکہ ایک ساعت کے لیے بھی میری وجہ سے اس بندے کا چہرہ متغیر نہیں ہوا۔ (شعب الایمان للبیہقی)

صوفی کا لفظ نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ یہ لفظ بعد میں ایجاد ہوا اور اس کے مصداق بھی خود انسانوں نے مقرر کیے۔ قرآن و حدیث کی اصطلاح جہاد و قتال ہے۔ صوفی ازم کی سہل انگاری اور جہاد کی مشقت میں کوئی مماثلت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو مجاہدین کے ساتھ محبت ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④﴾ (الصّف)

''بے شک اللہ پسند کرتا ہے اُن لوگوں کو جو اس کی راہ میں قطار باندھ کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔

ایک اور جگہ ایمان کے دعوے داروں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ㉔﴾ (التوبة)

''(اے پیغمبرؐ!) کہہ دیجیے اگر تمہارے باپ' اور بیٹے' اور بھائی' اور عورتیں' اور برادری' اور مال جو تم کماتے ہو' اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو' اور رہائش گاہیں جن کو تم پسند کرتے ہو' تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کے راستے میں جہاد سے' تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے۔ اور اللہ راستہ

نہیں دیتا نافرمانوں کو''۔

قرآن وحدیث کی ان وضاحتوں کے باوجود بھی اگر کوئی مسلمان مروّجہ تصوف کے بے جہاد فلسفے کے ساتھ چمٹا رہتا ہے اور جہاد کی اہمیت سے غافل رہتا ہے تو یقیناً اسے راہِ صواب تلاش کرنی چاہیے۔ نبی اکرمﷺ کا فرمان ہے کہ:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ))(۱)

''جس شخص نے اس حال میں انتقال کیا کہ نہ تو اس نے (اللہ کے راستے میں) جنگ کی اور نہ کبھی اس کی خواہش کی تو اس نے ایک قسم کی منافقت کی حالت میں انتقال کیا۔''

اللہ کے راستے میں جہاد وقتال کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جذبۂ جہاد سے سرشار تھے۔ جب دورِ نبویؐ اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں بہادری کے کارنامے انجام دینے والے اسلام کے عظیم ترین جرنیل خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا تو وہ حسرت سے کہہ رہے تھے کہ ساری عمر جہاد وقتال میں گزاری' شہادت کی تمنا رہی مگر آج گھر میں موت آ رہی ہے!

رسول اللہﷺ خود فرماتے تھے کہ:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيَا' ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا' ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا' ثُمَّ اُقْتَلُ))(۲)

''قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میری دلی آرزو ہے کہ میں راہِ خدا میں شہید کیا جاؤں اور مجھے پھر زندہ کر دیا جائے' اور میں پھر شہید کیا جاؤں اور پھر مجھے زندہ کیا جائے' اور میں پھر شہید کیا جاؤں اور پھر مجھے زندگی عطا فرمائی جائے اور پھر میں شہید کیا جاؤں''۔

جہاد تو نام ہے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے مال اور جان کی قربانی کرنے کا۔ اور یہ مسلمان کے لیے ایمان ویقین کا جزوِ لاینفک ہے: ؎

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں' میں اسی لیے نمازی!

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسہ بالغزو۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الجہاد والسیر' باب تمنی الشہادۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب فضل الجہاد والخروج فی سبیل اللّٰہ۔

قرآنِ مجید میں جہاد کی ترغیب پر درجنوں آیات ہیں۔ گویا جہاد کی اہمیت کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سورۃ التوبہ کی جہاد کے موضوع پر بہت سی آیات ہیں' ان میں سے صرف ایک آیت اس طرح ہے:

﴿اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ ۙ اَعۡظَمُ دَرَجَةً عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ (ان کے لیے) اللہ کے ہاں بڑا درجہ ہے' اور وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں''۔

تصوف کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اصحابِ صُفّہ کا تذکرہ اتنا ہی بے محل ہے جتنا غارِ حرا میں رسول اللہ ﷺ کی خلوت نشینی سے چلہ کشی کا جواز پیدا کرنا۔ کیونکہ اصحابِ صفہ تو حصولِ تعلیم کے لیے معیشت اور معاشرت کی تمام مصروفیات چھوڑ کر مسجد نبویؐ میں براجمان ہو گئے تھے۔ جونہی ان کی تعلیم و تربیت مکمل ہوتی تھی وہ وہاں سے نکل کر بھرپور زندگی گزارتے تھے اور جہاد کے لیے اپنے آپ کو تیار پاتے تھے۔

چونکہ صوفیاء عموماً نیک نفس' پاک باطن' بلند اخلاق' منکسر المزاج' خوش اطوار اور عبادت گزار ہوتے ہیں' لہٰذا ان کی زندگیوں میں دیکھنے والوں کے لیے کشش ہوتی ہے۔ اسی کشش کا اثر تھا کہ برعظیم پاک و ہند میں صوفیائے کرام کی سیرت و کردار اور شرافت سے متأثر ہو کر ہزاروں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ یہ اُن کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے' لیکن اُن کی دی ہوئی تعلیم میں جو خلا رہ گیا ہے اس کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے۔ انہوں نے لوگوں کو اسلامی اخلاق' پاکیزگیٔ نفس اور عبادات کی اہمیت سے روشناس کرایا' مگر اسلام کی خاطر جان و مال کی قربانی کے باب کو پس منظر میں رکھا۔ ان کی نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے تحت' وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے وہ لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا مشن اختیار کیے ہوئے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آج خود مسلمان دین کو ہمہ پہلو کامل تسلیم کرنے کے باوجود مال و جان کے ساتھ جہاد کی اہمیت کو نظر انداز کر دیں۔ وہ جہاد جس کا حکم واضح طور پر قرآن مجید میں بار بار دیا گیا ہے' کتب حدیث کے درجنوں صفحات میں اس کی اہمیت بتائی گئی

ہے اور سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی اپنی زندگی اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی زندگیاں جہاد و قتال میں بسر ہوئیں۔ رسالت مآب ﷺ کی زندگی کا مدنی دَور صرف دس سال ہے۔ اس مختصر مدت میں چھوٹے بڑے درجنوں معرکے ہوئے جن میں سے کچھ میں خود آپؐ نے بنفس نفیس حصہ لیا اور کچھ دیگر سپہ سالاروں کی سرکردگی میں انجام پائے۔ پس یہ حقیقت ہر وقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ جہاد کے بغیر اسلام کا تصور ادھورا اور نامکمل ہے۔

بقیہ: تصورِ عدل

یہاں تک کہ وہ اس کی سزا بھگتنے کے بعد ہی اس سے باہر آئے گا''۔ (ابوداؤد' کتاب القضاء)

اسلام کے نظامِ عدل میں اسلامی ریاست کا صدر اور عام شہری برابر ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کر کے عملاً اس کی توثیق کی ہے۔ ہم اوپر کی سطور میں وفات سے پہلے مجمع عام میں آپؐ کے ایسے ہی اعلان کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ ہم یہاں اس حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

> ابوخراس کہتا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں ہم سے فرمایا: ''میں نے اپنے گورنروں کو اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ تمہاری پٹائی کریں اور ناحق تم سے مال وصول کریں' اس سلسلہ میں جس آدمی کو کوئی شکایت ہو وہ میرے پاس آئے میں اس سے قصاص دلواؤں گا''۔ (مصر کے گورنر) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر کوئی حاکم تہذیب سکھانے کی غرض سے کسی آدمی کو سزا دے تو کیا آپ اس سے بھی بدلہ دلوائیں گے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''ہاں' اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری زندگی ہے' میں اسے بدلہ دلاؤں گا' میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آنجنابؐ نے اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کر دیا''۔ (ابوداؤد)

اخذ و استفادہ:

☆ تفہیم القرآن' جلد اول' دوم' ہشتم۔
☆ تدبر قرآن' از مولانا امین احسن اصلاحی۔
☆ سیرت النبی ﷺ' از شبلی نعمانی' جلد دوم و ششم۔
☆ مفردات القرآن' جلد دوم۔
☆ اسلامی نظامِ حکومت میں عدلیہ کا مقام' از سید معروف شیرازی۔
☆ ترجمان الحدیث' حصہ اوّل' از سید محمود حسن۔

شریعت کی چار بنیادی اصطلاحات

حافظ طاہر اسلام عسکری

شرک' کفر' نفاق اور بدعت شریعت کی چار اہم اور اساسی اصطلاحات ہیں۔ زیر نظر تحریر میں ان کے معنی و مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۱) شرک

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں جتنے انبیاء کرام علیہم السلام بھی مبعوث فرمائے' ان کی دعوت کا بنیادی ترین نکتہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو شرک سے مجتنب رہنے کی تلقین کرتے اور اس کی قباحتوں سے آگاہ کر کے عقیدۂ توحید کو اپنانے کی ترغیب دیتے تھے۔ ذیل میں شرک کے حوالے سے کتاب وسنت کی روشنی میں چند نکات پیش خدمت ہیں:

☆ تعریف

اللہ ربّ العزت کی ربوبیت اور الوہیت میں کسی کو شریک سمجھنا شرک کہلاتا ہے۔ عام طور پر شرک الوہیت میں کیا جاتا ہے' جیسا کہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارتے ہیں یا غیر اللہ کے لیے ایسے افعال بجالاتے ہیں جو عبادت میں شامل ہوتے ہیں' جیسے ذبح' نذر' خوف' امید اور محبت وغیرہ۔

☆ شرک سب سے بڑا گناہ کیوں؟

اللہ عزوجل کی نافرمانی کو گناہ کہتے ہیں۔ اپنی نوعیت اور درجے کے اعتبار سے گناہ کی مختلف اقسام اور صورتیں ہیں۔ تاہم شرک کو سب سے بڑا گناہ کہا گیا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

(۱) **مخلوق کو خصائص اُلوہیت میں خالق کے ساتھ تشبیہہ دینا:** جو شخص خدا کے ساتھ کسی کو

شریک ٹھہراتا ہے وہ درحقیقت اسے اللہ سے تشبیہہ دیتا ہے اور یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ﴾ (لقمٰن)

''بلاشبہ شرک ظلم عظیم ہے''۔

ظلم سے مراد ہے: ''وَضۡعُ الشَّیۡءِ فِیۡ غَیۡرِ مَحَلِّهٖ'' یعنی کسی چیز کو غلط جگہ پر رکھنا۔ تو جو کوئی اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرتا ہے وہ عبادت کو اس کی اصل جگہ کے بجائے غلط جگہ میں رکھتا اور اسے ایسی ہستی کی جانب پھیرتا ہے جو اس کی مستحق نہیں۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہوسکتا ہے؟

(۲) بغیر توبہ کے شرک کا معاف نہ ہونا: باری تعالیٰ اپنے بندوں پر انتہائی مہربان ہے۔ وہ چاہے تو اپنے گناہگار بندوں کو توبہ کے بغیر بھی معاف کرسکتا ہے۔ لیکن شرک اتنا بڑا جرم ہے کہ ارحم الراحمین نے بھی اعلان فرما دیا ہے کہ دنیا میں جو گناہِ شرک سے توبہ نہ کرے گا قیامت کے دن اس کے لیے کوئی معافی نہیں۔ ربّ ذوالجلال کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِهٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ﴾

(النساء:۴۸،۱۱۶)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشے گا اور اس کے علاوہ جس کے لیے جو چاہے گا معاف فرما دے گا''۔

(۳) مشرک پر جنت کا حرام ہونا اور اس کا دائمی جہنمی ہونا: اللہ ربّ العزت کے ہاں شرک اس قدر قبیح اور شنیع ہے کہ اس نے جنت میں مشرک کا داخلہ ہمیشہ کے لیے ممنوع قرار دے کر واضح کر دیا کہ جہنم ہی اس کا دائمی مستقر ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّهٗ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیۡهِ الۡجَنَّةَ وَمَاۡوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۷۲﴾﴾ (المائدة)

''جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو اللہ اس پر جنت حرام کر چکا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا''۔

(۴) شرک سے تمام اعمال صالحہ کا ضائع ہونا: شرک ایسا ہلاکت خیز جرم ہے کہ اس کا مرتکب اپنے نیک اعمال کو بھی ضائع و برباد کر بیٹھتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ شرک کے اس پہلو

کی وضاحت کرتے ہوئے اٹھارہ انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِکَ هُدَی اللّٰهِ یَهۡدِیۡ بِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖؕ وَلَوۡ اَشۡرَکُوۡا لَحَبِطَ عَنۡهُمۡ مَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ﴿۸۸﴾﴾ (الانعام)

''یہ اللہ کی ہدایت ہے' وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کو سجھائے۔ اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو ان کا کیا کرایا (سب) اکارت ہو جاتا۔''

ایک اور مقام پر موحد اعظم سیدنا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے شرک کے اس تباہ کن پہلو کو یوں اُجاگر کیا گیا ہے:

﴿لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ﴾ (الزُّمر)

''اگر (بفرضِ محال) آپ نے شرک کیا تو آپ کا کیا کرایا (سب) لازماً اکارت جائے گا اور آپ لازماً خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے''۔

(۵) مشرک کے خون اور مال کا مباح ہونا: اللہ کے ساتھ کسی اور کو مستحق عبادت سمجھنے والا اپنے جان و مال کی عصمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ حَیۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡهُمۡ وَخُذُوۡهُمۡ وَاحۡصُرُوۡهُمۡ وَاقۡعُدُوۡا لَهُمۡ کُلَّ مَرۡصَدٍ﴾ (التوبة:۵)

''تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو' اور ان کو قید کر لو' اور گھیر لو اور اُن کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو۔''

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((اُمِرۡتُ اَنۡ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوۡلُوۡا لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ' فَاِذَا قَالُوۡا لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ عَصَمُوۡا مِنِّیۡ دِمَاءَ هُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ اِلَّا بِحَقِّهَا))[1]

''مجھے لوگوں سے اُس وقت تک لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ لا الٰہ الاّ اللہ کا اقرار نہ کر لیں' پس جب وہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیں گے تو مجھ سے اپنے خون اور اموال بچا لیں گے' سوائے اس (کلمۂ طیبہ) کے حق کے۔''

(۶) از روئے حدیث نبویؐ شرک کا اکبر الکبائر ہونا: مندرجہ بالا نصوصِ قرآنیہ سے بھی اگرچہ یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے' لیکن حضور نبی کریم ﷺ نے پوری صراحت سے اس کے بارے میں فرما دیا ہے کہ:

((اَلاَ اُنَبِّئُکُمْ بِاَکْبَرِ الْکَبَائِرِ؟)) قَالُوْا : بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰهِ' قَالَ :
((اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ))(۲)

''کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہ کی خبر نہ دوں؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسول اللہ! فرمایا: ''سب سے بڑا گناہ ہے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔''

شرک عظیم ترین ظلم جبکہ توحید اصل عدل ہے' لہٰذا جو شے عدل کے بالکل الٹ اور منافی ہو وہ اکبرالکبائر ہی ہوگی۔ پس شرک قطعی طور پر اکبرالکبائر ہے۔ لہٰذا اللہ نے مشرک پر جنت حرام کر دی ہے' اس کے مال و جان کو مباح قرار دے دیا ہے' اس کے کسی بھی عمل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے' اس کے بارے میں کسی بھی قسم کی سفارش کو مسترد کر دیا ہے اور آخرت میں اس کی ہر پکار اور التجا کی عدم قبولیت کا فیصلہ کر دیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مشرک اللہ تعالیٰ کے بارے میں سب سے بڑا جاہل اور بے خبر ہے جو اللہ کی مخلوق میں سے ہی کسی کو اس کا شریک ٹھہراتا ہے۔ یہ اس کے ظلم کی انتہا کے ساتھ ساتھ غایت درجے کی جہالت بھی ہے' اگرچہ مشرک ربّ کریم پر ظلم کے بجائے درحقیقت اپنے آپ پر ہی ظلم ڈھاتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴿۵۷﴾﴾ (البقرۃ)

''اور انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا' بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔''

(۷) اللہ وحدہٗ لاشریک کا اپنے آپ سے شرک جیسے عیب و نقص کی نفی کرنا: شرک کے اکبرالکبائر اور ظلم عظیم ہونے کا علم اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک نے شرک کو عیب اور نقص قرار دیتے ہوئے اس سے اپنے آپ کو پاک قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴿۴۳﴾﴾ (الطور)

''اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک ہے''۔

لہٰذا جو شخص اللہ جل شانہٗ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ سے کھلی دشمنی کرتا اور اس کے مقابلے میں آنے کی جرأت کرتا ہے۔

اقسامِ شرک

شرک کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

3

(۱) شرکِ اکبر

پہلی قسم شرکِ اکبر ہے' جس سے انسان ملت اسلامیہ سے خارج ہو جاتا ہے' اور اگر توبہ کیے بغیر مر جائے تو دائمی جہنمی ٹھہرتا ہے۔ شرکِ اکبر یہ ہے کہ انسان عبادت کی کسی قسم کو غیر اللہ کے لیے بجالانا شروع کر دے' مثلاً غیر اللہ سے دعا کرنا' ذبح یا نذر کے ذریعے اصحابِ قبور' جن یا شیاطین کا قرب حاصل کرنا' جن' شیاطین یا کسی مُردہ ہستی کا یہ خوف رکھنا کہ وہ اسے نقصان پہنچائیں گے یا بیمار کر دیں گے اور اللہ کے علاوہ کسی ہستی سے ایسے معاملات کی امید رکھنا جن پر سوائے خدا کے کوئی قدرت نہیں رکھتا' مثلاً مشکلات و مصائب سے نجات اور اپنی حاجات و ضروریات کی تکمیل وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لاَ يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ط﴾ (یونس:۱۸)

''اور وہ اللہ کے سوا اُن لوگوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔''

(۲) شرکِ اصغر

دوسری قسم شرکِ اصغر ہے۔ یہ انسان کو اسلام سے تو خارج نہیں کرتا البتہ اس سے توحید میں نقص آتا ہے اور یہ شرکِ اکبر تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کی مزید دو قسمیں ہیں:

(ا) شرکِ ظاہر: شرک ظاہر الفاظ اور افعال میں ہوتا ہے۔ گفتگو اور اقوال میں شرکِ ظاہر کی مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱) غیر اللہ کی قسم اٹھانا: رسول مکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ كَفَرَ اَوْ اَشْرَكَ))[۳]

''جس نے اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم اٹھائی اس نے کفر یا شرک کیا''۔

(۲) یہ کہنا کہ ''مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ'' کہ جو خدا اور آپ چاہیں۔ ایک مرتبہ حضور نبی کریم ﷺ سے کسی شخص نے یہی الفاظ کہے تو آپؐ نے فرمایا:

((اَجَعَلْتَنِیْ وَاللّٰهَ عَدْلًا؟ بَلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ)) [٤]

''کیا تو نے مجھے اور اللہ کو برابر ٹھہرا دیا؟ بلکہ اس طرح کہو کہ جو اکیلا اللہ چاہے''۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

((اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰہِ نِدًّا؟ قُلْ مَا شَاءَ اللّٰـهُ وَحْدَهٗ)) (٤ الف)

''کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا ہے؟ تم یوں کہو کہ جو اکیلا اللہ چاہے''۔

(۳) اسی طرح ''لَوْلَا اللّٰهُ وَفُـلَانٌ'' (اگر اللہ اور فلاں نہ ہوتا) کہنا بھی شرک ظاہر قولی کی مثال ہے۔ البتہ یوں کہا جا سکتا ہے ''مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ فُلَانٌ'' (جو اللہ چاہے اور پھر فلاں) اور یہ بھی کہ ''لَوْ لَا اللّٰهُ ثُمَّ فُلَانٌ'' (اگر اللہ اور پھر فلاں نہ ہوتا)۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ ثُمَّ ترتیب کے ساتھ تراخی کا مفہوم دیتا ہے۔ گویا بندے کی مشیت اللہ کی مشیت کے تابع ہوتی ہے' جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٩﴾﴾ (التکویر)

''اور تم جب ہی چاہ سکتے ہو کہ چاہے اللہ سارے جہان کا مالک۔''

رہا ''واوٗ'' تو وہ مطلق جمع کے لیے آتا ہے اور اشتراک ترتیب یا تعقیب کا متقاضی نہیں ہوتا۔ ''مَالِیْ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنْتَ'' (میرا اللہ اور تمہارے سوا کوئی نہیں) اور ''هٰذَا مِنْ بَرَكَاتِ اللّٰهِ وَبَرَكَاتِكَ'' (یہ اللہ اور تمہاری برکات میں سے ہے) یہ دونوں اقوال بھی اسی کی مثال ہیں اور ایسا کہنا درست نہیں۔

شرکِ ظاہر کی مندرجہ بالا مثالیں تو اقوال والفاظ سے متعلق تھیں۔ رہے افعال تو ان کے حوالے سے ظاہری شرک کی مثال یہ ہے کہ انسان مصیبت و پریشانی سے نجات کی خاطر تعویذ گنڈے یا دھاگے وغیرہ باندھنا شروع کر دے' جیسا کہ نظر لگنے کے ڈر سے لوگ تعویذ لٹکا لیتے ہیں۔ اگر تو عقیدہ یہ ہو کہ یہ اشیاء کسی مشکل و مصیبت کو دور کرنے کا ذریعہ ہیں تو یہ شرکِ اصغر ہے۔ لیکن یہ اعتقاد رکھنا کہ یہ دھاگے' منکے اور تعویذ بذاتِ خود مصائب کو ٹالتے ہیں تو یہ شرکِ اکبر ہے' کیونکہ یہ غیر اللہ میں شامل ہیں۔

(ب) شرکِ خفی: شرکِ اصغر کی دوسری قسم مخفی شرک ہے۔ اس کا تعلق ارادہ ونیت سے ہوتا ہے' جیسے ریاکاری' کہ کوئی شخص ایسا عمل کرے جس سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے لیکن اس کا ارادہ لوگوں سے تعریف وستائش کا حصول ہو۔ مثلاً وہ خضوع وخشوع سے نماز پڑھتا ہے اور نیت یہ ہے کہ لوگ یہ کہیں کہ یہ تو بڑا عبادت گزار اور متقی ہے' یا خوبصورت آواز میں ذکر و تلاوت کرتا ہے تا کہ لوگ اس کی تعریف وتوصیف کریں کہ یہ بڑا قاری اور خوش الحان ہے۔ ریاکاری کا یہ

عنصر جب عمل میں شامل ہو جاتا ہے تو اسے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ (الکھف)

''پس جو کوئی اپنے ربّ سے ملاقات کی امید رکھتا ہے اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔''

رسولِ معظم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْاَصْغَرُ)) قَالُوْا : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَمَا الشِّرْكُ الْاَصْغَرُ؟ قَالَ : ((اَلرِّيَاءُ ......))[۵]

''مجھے تم پر سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ شرکِ اصغر ہے''۔ صحابہؓ نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! شرکِ اصغر کیا ہے؟ فرمایا: ''ریا کاری......''

اسی طرح مال و دولت کے حصول کی خاطر نیک اعمال کرنا بھی شرکِ خفی میں شامل ہے' مثلاً کوئی شخص اس نیت سے حج یا جہاد کرے کہ اس سے پیسہ حاصل ہوگا یا تعلیم دین' امامتِ نماز اور اذان جیسے معاملات پر دُنیوی اجر و جزا کا خواہش مند ہو۔ پیغمبر اعظم ﷺ کا ارشاد ہے:

((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ وَعَبْدُ الْخَمِيْصَةِ ' اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَاِنْ لَّمْ يُعْطَ سَخِطَ ......))[۶]

''درہم و دینار اور چادر کا بندہ ہلاک ہو گیا' کہ اگر اسے دیا جائے تو راضی رہے اور نہ دیا جائے تو ناراض ہو جائے''۔

علامہ ابن القیم الجوزیہؒ فرماتے ہیں:

''ارادوں اور نیتوں کا شرک ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں۔ اس سے بچنے والے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ جس نے اپنے عمل سے خوشنودیٔ ربّ کے سوا کسی اور شے کا ارادہ کیا' یا قربِ الٰہی کے بجائے کسی اور چیز کی نیت کی اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور سے اس کی جزا چاہی تو وہ اپنی نیت و ارادہ میں شرک کا مرتکب ٹھہرا۔ اخلاص تو یہ ہے کہ بندہ اپنے قول و فعل اور ارادہ و نیت کو ربّ کریم کے لیے خالص کر دے۔ یہی وہ یکسو ملت ابراہیمی ہے جسے اختیار کرنے کا حکم اللہ نے اپنے تمام بندوں کو دیا ہے اور وہ اس کے علاوہ کسی عقیدہ و عمل کو قبول نہ فرمائے گا۔ یہی اسلام کی اصل حقیقت ہے'

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ‌ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ‏ ﴿۸۵﴾﴾ (آل عمران)

''اور جو کوئی اسلام کے علاوہ دین چاہے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا' اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا''۔

سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اسی ملت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جو اس سے منہ موڑے گا وہ سب سے بڑا جاہل اور بے وقوف ہوگا!!'' (۷)

شرکِ اکبر اور شرکِ اصغر میں فرق

مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ شرکِ اکبر اور شرکِ اصغر میں امورِ ذیل کی بنا پر فرق کیا جاسکتا ہے:

(۱) شرکِ اکبر کے ارتکاب سے انسان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے' لیکن شرکِ اصغر کا مرتکب مسلمان ہی رہتا ہے۔

(۲) آخرت میں شرک اکبر کی سزا یہ ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والا دائمی جہنمی ہے' جبکہ شرکِ اصغر کرنے والا اگر جہنم میں گیا بھی تو ہمیشہ وہاں نہیں رہے گا۔

(۳) شرکِ اکبر انسان کے تمام اعمالِ صالحہ کو ضائع اور رائیگاں کر دیتا ہے' مگر شرکِ اصغر (بصورت ریاکاری) محض اسی عمل کو ضائع کرتا ہے جس میں نیت خالص نہ ہو اور وہ دُنیوی جاہ ومنصب' مال ودولت یا نمود وشہرت کے حصول کے لیے بجالایا جائے۔

(۴) جو شخص شرکِ اکبر کا مرتکب ہو اس کا مال وجان مباح ہو جاتا ہے' لیکن شرکِ اصغر سے جان ومال کی حرمت باقی رہتی ہے۔

موجودہ زمانے میں شرک کے بعض مظاہر

دیگر تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح حضور نبی کریم ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد بھی تبلیغِ توحید اور تردیدِ شرک تھا۔ لہٰذا آپؐ نے نہ صرف یہ کہ اپنے مقصدِ رسالت کو کما حقہٗ پورا کیا بلکہ ان تمام راستوں کو بھی بند کر دیا جو شرک تک پہنچانے کا باعث بن سکتے تھے۔ اگر نبوی تعلیمات پر عمل کیا جاتا تو کلمہ پڑھنے والے آج اولیاء وصالحین کی قبروں پر شرک کرتے نظر نہ

آتے۔ جہاں کوئی مزار یا مقبرہ نظر آتا ہے وہاں لوگ دعائیں اور مرادیں مانگتے‘ نذر و نیاز اور چڑھاوے پیش کرتے اور مٹی کی ڈھیریوں پر ماتھا ٹیکتے نظر آتے ہیں۔ رسول مکرمﷺ نے مزارات و قبور پر ہونے والے اس شرک کو روکنے کے لیے جو ہدایات اپنی اُمت کو دیں انہیں ملاحظہ فرمائیے اور غور کیجیے کہ کس طرح نبی کریمﷺ نے شرک جیسے ظلم عظیم کا سدّ باب فرمایا ہے۔

(۱) رسول اللہﷺ نے اولیاء و صالحین کے باب میں غلو اور افراط و تفریط کا رویہ اپنانے سے منع فرمایا‘ کیونکہ یہی شے ان کی عبادت و پرستش کی طرف لے جاتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہﷺ کا ارشاد ہے:

((وَاِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ ، فَاِنَّمَا اَهْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمُ الْغُلُوُّ فِی الدِّیْنِ)) (۸)

’’خبردار! غلو سے بچ کر رہنا کہ تم سے پہلے لوگوں کو غلو نے ہی ہلاک کیا تھا۔‘‘

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نصاریٰ کے غلو کو دیکھتے ہوئے رسول اللہﷺ کو خدشہ تھا کہ مسلمان بھی اس راہ پر چلتے ہوئے کہیں آپﷺ کو مراتب الوہیت میں شریک نہ کر دیں‘ لہٰذا اس کے پیش نظر فرمایا:

((لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی ابْنَ مَرْیَمَ، فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ)) (۹)

’’میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو جیسا کہ عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریمؑ کے بارے میں کیا۔ میں تو صرف خدا کا بندہ ہوں‘ لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی کہا کرو۔‘‘

(۲) رسول معظمﷺ نے قبروں کو بلند اور پختہ کرنے اور ان پر کسی بھی قسم کی تعمیرات کو ممنوع قرار دیا‘ چنانچہ ابوالہیاج اسدیؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’کیا میں تمہیں اس کام پر نہ بھیجوں جس پر رسول اکرمﷺ نے مجھے بھجوایا تھا؟ اور وہ یہ ہے کہ تو کوئی مورتی مسمار کیے بغیر نہ چھوڑ اور ہر بلند قبر کو برابر کر دے‘‘۔ (۱۰)

نیز سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول معظمﷺ نے قبر کو پختہ کرنے‘ اس پر بیٹھنے اور اس پر تعمیر کرنے سے منع کیا۔

(۳) حضور نبی کریمﷺ نے قبروں کے پاس نماز پڑھنے سے بھی روکا۔ اُمّ المؤمنین

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایامِ مرض میں جب رسول اکرم ﷺ کی تکلیف بڑھ جاتی تو اپنا پلو چہرۂ مبارک پر ڈال لیتے اور جب ذرا افاقہ ہوتا تو چہرۂ انور سے کپڑا ہٹا دیتے۔ اس دوران آپؐ نے فرمایا:

((لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الْیَھُوْدِ وَالنَّصَارٰی اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ مَسَاجِدَ)) (۱۱)

''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے' انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں (عبادت گاہیں) بنالیا ہے''۔

نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلَا وَاِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ وَصَالِحِیْھِمْ مَسَاجِدَ ' اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ' اِنِّیْ اَنْھَاکُمْ عَنْ ذٰلِکَ)) (۱۲)

''سنو! تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء اور صلحاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا کرتے تھے۔ خبردار! تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنالینا' میں تمہیں اس سے روکتا ہوں''۔

قبروں کو مسجد بنانے سے مراد یہ ہے کہ اس کے پاس نماز پڑھی جائے خواہ ان پر کوئی عمارت تعمیر نہ بھی کی گئی ہو۔ اس لیے کسی جگہ نماز کا قصد کرنا اسے مسجد بنانے کے مترادف ہے' جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

((جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَھُوْرًا)) (۱۳)

''میرے لیے ساری زمین مسجد اور پاک قرار دی گئی ہے۔''

لیکن جب کسی قبر پر باقاعدہ مسجد تعمیر کر لی جائے تو معاملہ سنگین تر ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں قبروں اور مزارات کے باب میں نبی کریم ﷺ کی ہدایات و تعلیمات۔ لیکن افسوس کہ آج ان کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جارہی ہے' جس کی بنا پر لوگ شرکِ اکبر کے بھی مرتکب ہو بیٹھے ہیں۔ چنانچہ قبروں پر مساجد' مقابر اور مزارات تعمیر ہو رہے ہیں اور وہاں ہر قسم کے شرکِ اکبر کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ لوگ قبروں والوں کے لیے جانور ذبح کرتے ہیں' ان سے فریاد رسی کے لیے التجائیں کرتے ہیں اور ان کے نام کی نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ علامہ ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو شخص قبروں کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کی سنت' آپؐ کے امر و نہی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل اور موجودہ زمانے کے لوگوں کے رویے میں تقابل کرے گا وہ

ان میں ایسا کھلا ہوا تضاد پائے گا کہ یہ دونوں رویے کبھی بھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ نبی مکرم ﷺ نے تو قبروں کے پاس نماز پڑھنے سے روکا ہے' لیکن یہ لوگ وہاں نمازیں پڑھتے ہیں۔ آپؐ نے ان کو مسجد بنانے سے منع کیا ہے' مگر یہ ان پر مساجد تعمیر کرتے ہیں اور اللہ کے گھروں کے بالمقابل انہیں 'مشاہد' کا نام دیتے ہیں۔ رسول معظم ﷺ نے قبروں پر چراغ جلانے کو ممنوع قرار دیا ہے' جبکہ یہ وہاں مشعلیں روشن کرتے ہیں۔ آپؐ نے قبروں پر میلے لگانے سے باز رہنے کا حکم دیا ہے' لیکن ان لوگوں نے انہیں عیدگاہ اور قربان گاہ بنا رکھا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے قبروں کو برابر کرنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ مسلم میں سیدنا علیؓ سے منقول ہے اور صحیح مسلم میں ہی ثمامہ بن شفی سے مروی ہے کہ ہم فضالہ بن عبید کے ساتھ روم میں تھے۔ وہاں ہمارا ایک ساتھی انتقال کر گیا تو فضالہ نے اس کی قبر برابر کرنے کا حکم دیا اور کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپؐ نے قبر کو برابر کرنے کا حکم دیا' لیکن یہ لوگ مذکورہ بالا احادیث کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کرتے ہوئے ان کو گھروں کی طرح بلند و بالا کرتے اور ان پر قبے تعمیر کرتے ہیں''۔

ابن قیم آگے چل کر کہتے ہیں:

''آپ دیکھئے کہ قبروں کے بارے میں نبی مکرم ﷺ اور ان لوگوں کے طرزِ عمل میں کس قدر تباین و تضاد نظر آتا ہے۔ یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اس میں اتنی خرابیاں اور نقصانات ہیں کہ انسان انہیں شمار کرنے سے قاصر ہے''۔

بعد ازاں ان مفاسد کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:

''حضور نبی کریم ﷺ نے جس مقصد کے لیے زیارتِ قبور کا حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ آخرت کی یاد تازہ ہو اور فوت شدہ کے ساتھ نیکی کی جائے بایں طور کہ اس کے حق میں دعائے خیر کی جائے اور بارگاہِ الٰہی میں اس کے لیے رحمت' بخشش اور عافیت کی درخواست کی جائے۔ یہ زیارت کرنے والے کا فوت شدہ سے بھی حسن سلوک ہے اور خود اپنے آپ سے بھی۔ لیکن ان مشرکوں نے الٹا معاملہ شروع کر دیا اور دین کے برخلاف عمل کرنے لگے۔ انہوں نے زیارتِ قبور کا مقصد یہ سمجھا کہ میت کو خدا کا شریک بنا دیا جائے۔ چنانچہ یہ اس سے دعائیں کرنے لگے' اسی سے اپنی ضروریات طلب کرنے لگے اور اسی سے برکات اور اپنے دشمنوں کے خلاف مدد مانگنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے حق میں بھی برا کیا اور قبروں والوں سے بھی اچھائی نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ یہ اس برکت سے محروم ہو گئے جو اللہ نے فوت شدگان کے لیے رحمت و بخشش کی التجاء اور دعائے خیر میں رکھی تھی''۔ (١٤)

مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ مزارات پر نیازیں اور چڑھاوے پیش کرنا شرکِ اکبر ہے۔ اس کا سبب رسول اکرم ﷺ کے ارشادات کی مخالفت ہے کہ قبروں پر قبے اور مساجد تعمیر نہ کی جائیں۔ اس لیے کہ مزارات اور قبور کو دیکھ کر جاہل یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں مدفون ہستیاں نفع ونقصان پہنچانے پر قادر ہیں' چنانچہ وہ ان سے فریاد رسی چاہتے' اپنی ضروریات کے لیے التجائیں کرتے اور ان کو نذرانے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ قبریں گویا بُت بن جاتی ہیں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر پوجا جاتا ہے۔ رسولِ معظم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ:

((**اَللّٰھُمَّ لَا تَجعَلُ قَبرِیُ وَثَنًا یُعبَدُ**)) (١٥)

''خدایا! میری قبر کو بت نہ بنا دینا کہ اسے پوجا جائے''۔

اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ رسول اکرم ﷺ کے علاوہ دوسروں کی قبروں کو پوجنے کے مرتکب ہوں گے۔ چنانچہ بہت سے مسلمان ملکوں میں ایسا ہو رہا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کی دعا کی برکت سے آپؐ کی قبر مبارک کو اس سے بچا لیا ہے۔ اگرچہ مسجد نبوی میں بعض جاہل لوگ خرافات کرتے ہیں' مگر وہ نبی مکرم ﷺ کی قبر انور تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں' کیونکہ آپؐ کی قبر مبارک مسجد میں نہیں بلکہ حجرۂ عائشہؓ میں ہے اور اس کے اردگرد دیواریں ہیں۔

(جاری ہے)

حواشی

(١) صحیح البخاری' کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة' باب قول اللّٰہ تعالیٰ : وَاَمرُھُم شُورٰی بَینَھُم۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الامر بقتال الناس حَتّٰی یَقُولُوا لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ۔

(٢) صحیح البخاری' کتاب الشهادات' باب ما قیل فی شهادة الزور۔وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان الکبائر واکبرها۔

(٣) سنن الترمذی' کتاب النذور والایمان عن رسول اللّٰہ ﷺ' باب ما جاء فی کراھیة الحلف بغیر اللّٰہ۔ حسنه وصححه الحاکم۔

(٤) مسند احمد۔

بقیہ حواشی: شریعت کی چار بنیادی اصطلاحات

(٤) الجواب الکافی لابن القیم : ١٠٢۔ وتحذیر الساجد للالبانی : ١٤٥۔

(٥) رواہ احمد والطبرانی والبغوی فی شرح السنۃ۔

(٦) صحیح البخاری' کتاب الجہاد والسیر' باب الحراسۃ فی الغزو فی سبیل اللّٰہ۔

(٧) الجواب الکافی لابن القیم الجوزیہ' ص ١١٥۔

(٨) سنن النسائی' کتاب مناسک الحج' باب التقاط الحصی۔

(٩) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب قول اللّٰہ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا۔

(١٠) صحیح مسلم' کتاب الجنائز' باب الامر بتسویۃ القبور۔

(١١) صحیح البخاری' کتاب الصلاۃ' باب الصلاۃ فی البیعۃ۔

(١٢) صحیح مسلم' کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ' باب النھی عن بناء المساجد علی القبور واتخاذ الصور۔

(١٣) صحیح البخاری' کتاب الصلاۃ' باب قول النبی ﷺ جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا۔

(١٤) اغاثۃ اللھفان لابن القیم' ج ١' ص ٢١٤ تا ٢١٧۔

(١٥) موطأ امام مالک' کتاب النداء للصلاۃ' باب جامع الصلاۃ۔

بحث و نظر

ایک تیسرے فریق کے خلاف
مسلمانوں اور اہل روم کی مشترکہ جنگ

عالمی حالات اور احادیثِ نبویؐ کی روشنی میں

از: محمد نذیر یٰسین

زیر نظر مضمون نبی کریم ﷺ کی کچھ احادیث کے متعلق ہے جن میں ایک تیسرے فریق کے خلاف مسلمانوں اور اہل روم کی مشترکہ معرکہ آرائی اور اس کے بعد پیش آنے والے حالات کی خبر دی گئی ہے۔ ان احادیث مبارکہ کے متعلق کئی نامور حضرات خیال آرائی کر چکے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ واقعہ پیش آ چکا ہے جبکہ کچھ لوگ ابھی تک اس کے ظہور پذیر ہو چکنے کے قائل نہیں ہیں۔ جو حضرات اس کو مستقبل کا ایک واقعہ قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں مستقبل میں دو بڑے اشتراکی ممالک' روس اور چین کا اتحاد قائم ہو جائے گا' پھر ان کی امریکہ اور یورپ کے ساتھ ایک ایسی ہولناک و تباہ کن عالمگیر جنگ ہوگی کہ اس کے نتیجے میں دنیا کی دو تہائی آبادی ہلاک ہونے کے علاوہ اس خطۂ ارضی سے تمام جدید ٹیکنالوجی اور ذرائع توانائی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا' لہٰذا اس کے بعد ہونے والی جنگیں زمانۂ قدیم کے ہتھیاروں سے ہی لڑی جا سکیں گی۔

جو حضرات اس واقعہ کے پیش آ چکنے کے قائل ہیں' اُن کی آراء میں بھی باہم اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد افغانستان میں روس کے خلاف لڑی جانے والی جنگ ہے تو بعض اسے ۱۹۹۱ء میں عراق کی بعثی حکومت کے خلاف اہل عرب اور اہل غرب کی مشترکہ جنگ پر منطبق کرتے ہیں۔ راقم نے عالمی حالات کے تناظر میں ان احادیث پر غور و فکر کے نتیجے میں جو رائے قائم کی ہے اس کے متعلق اپنے دلائل پیش کرنے سے قبل اس بارے میں وارد ہونے والی دو روایات کا متن اور ترجمہ پیش خدمت ہے:

(''بحث و نظر'' کے عنوان سے شائع ہونے والی تحریروں سے ادارۂ میثاق کا متفق ہونا ضروری نہیں!)

(۱) عَنْ ذِیْ مِخْمَرٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((تُصَالِحُوْنَ الرُّوْمَ صُلْحًا آمِنًا وَتَغْزُوْنَ اَنْتُمْ وَهُمْ عَدُوًّا مِنْ وَرَائِهِمْ فَتَسْلَمُوْنَ وَتَغْنَمُوْنَ ثُمَّ تَنْزِلُوْنَ بِمَرْجٍ ذِیْ تَلُوْلٍ، فَیَقُوْمُ اِلَیْهِ رَجُلٌ مِنَ الرُّوْمِ فَیَرْفَعُ الصَّلِیْبَ وَیَقُوْلُ: اَلَا غَلَبَ الصَّلِیْبُ، فَیَقُوْمُ اِلَیْهِ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَیَقْتُلُهٗ فَعِنْدَ ذٰلِکَ تَغْدِرُ الرُّوْمُ وَتَکُوْنُ الْمَلَاحِمُ فَیَجْتَمِعُوْنَ اِلَیْکُمْ فَیَأْتُوْنَکُمْ فِیْ ثَمَانِیْنَ غَایَةً مَعَ کُلِّ غَایَةٍ عَشَرَةُ آلَافٍ))(۱)

حضرت ذی مخمر رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عنقریب تم اوراہلِ روم امن کی خاطر صلح کرلو گے، پھرتم اور وہ مل کر ایک ایسے دشمن کے خلاف معرکہ آرائی کرو گے جوتم دونوں کے علاوہ ہوگا (یاتم دونوں کے عقب میں ہوگا)، پس تم فتح یاب ہو گے تمہیں مالِ غنیمت ملے گا اورتم سلامت ہو جاؤ گے۔ پھراس معرکہ سے واپسی پرتم ایک بلند ٹیلوں والی چراگاہ میں ہو گےتو نصرانیوں میں سے ایک شخص صلیب بلند کرے گا اور کہے گا: ''صلیب غالب آ گئی''تو (اس کے ردِّعمل میں) مسلمانوں میں سے ایک شخص (غصہ میں آکر) اسے قتل کرڈالے گا۔ پس اس موقع پراہل روم غداری کریں گےاور پھرخون ریز جنگیں ہوں گی، پس وہ تمہارے خلاف جمع ہوں گےاورتمہاری طرف اسّی (۸۰) جھنڈوں کے ساتھ آئیں گےاور ہرجھنڈے تلے دس ہزار کالشکر ہوگا''۔

(۲) عَنْ ذِیْ مِخْبَرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ: ((سَتُصَالِحُوْنَ الرُّوْمَ صُلْحًا آمِنًا فَتَغْزُوْنَ اَنْتُمْ وَهُمْ عَدُوًّا مِنْ وَرَاءِکُمْ فَتُنْصَرُوْنَ وَتَغْنَمُوْنَ وَتَسْلَمُوْنَ ثُمَّ تَرْجِعُوْنَ حَتّٰی تَنْزِلُوْا بِمَرْجٍ ذِیْ تَلُوْلٍ، فَیَرْفَعُ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ النَّصْرَانِیَةِ الصَّلِیْبَ فَیَقُوْلُ: غَلَبَ الصَّلِیْبُ، فَیَغْضَبُ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَیَدُقُّهٗ فَعِنْدَ ذٰلِکَ تَغْدِرُ الرُّوْمُ وَتَجْمَعُ لِلْمَلْحَمَةِ- زَادَ فِیْ رِوَایَةٍ: وَیَثُوْرُ الْمُسْلِمُوْنَ اِلٰی اَسْلِحَتِهِمْ فَیَقْتَتِلُوْنَ فَیُکْرِمُ اللّٰہُ تِلْکَ الْعِصَابَةَ بِالشَّهَادَةِ))(۲)

حضرت ذی مخبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوفرماتے ہوئے سنا: ''عنقریب تم اوراہل روم امن کی خاطرصلح کرلو گے، پھرتم اور وہ مل کر ایک ایسے دشمن کے خلاف معرکہ آرائی کرو گے جوتم دونوں کے علاوہ ہوگا، پس تم فتح یاب ہو گے، مالِ غنیمت حاصل کرو گے اورتم

(۱) مسند احمد۔

(۲) سنن ابی داوٗد، کتاب الملاحم، باب ما یذکر من ملاحم الروم۔

سلامت ہو جاؤ گے۔ پھر اس معرکہ سے واپسی پر تم ایک بلند ٹیلوں والی چراگاہ میں ہو گے تو عیسائیوں میں سے ایک شخص صلیب بلند کرے گا اور کہے گا صلیب غالب آ گئی۔ اس پر ایک مسلمان غضب ناک ہو کر اسے دھکا دے دے گا تو اس موقع پر اہل روم تم سے غداری کریں گے اور خونریز جنگ کے لیے جمع ہو جائیں گے''۔ ایک اور روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ ''مسلمان اپنے اسلحہ کی طرف لپکیں گے اور جنگ کریں گے' پس اللہ تعالیٰ اس جماعت کو شہادت کی عزت سے نواز دے گا''۔

بطورِ نمونہ تحریر کی گئی درج بالا دونوں روایات پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کی اہل روم سے صلح' ایک تیسرے فریق کے خلاف جنگ اور اس میں فتح و کامرانی تک تو کوئی اختلاف نہیں' البتہ ایک عیسائی کے صلیب اٹھا کر اظہارِ تفاخر کرنے اور اس پر ایک مسلمان کی طرف سے ردعمل ظاہر کرنے سے لے کر آخر تک دونوں روایات میں (بظاہر) تعارض پایا جاتا ہے۔ ان روایات کی حقیقت اور ان کے باہمی تعارض کو دور کرنے کے لیے ہمیں درج ذیل نکات کو سمجھنا ہو گا:

(۱) صلح ہمیشہ دو متحارب فریقوں کے مابین ہوتی ہے اور صلح نامہ کی شرائط خواہ کتنی ہی منصفانہ قرار دی جائیں' صلح نامے میں ایک فریق کو دوسرے پر بہر کیف برتری حاصل ہوتی ہے۔ صلح نامے کی ایک اہم خصوصیت تو یہ ہوتی ہے کہ دونوں متحارب فریق ایک دوسرے کے جداگانہ تشخص کو تسلیم کر لیتے ہیں' تاہم مستقبل کے حوالہ سے صلح نامہ کا یہ معاہدہ ایک فریق کے لیے پیغامِ شکست جبکہ دوسرے کے لیے پیغامِ فتح ہوتا ہے' اگرچہ دونوں فریق اپنی اپنی وقتی مصلحتوں کو مدنظر رکھ کر ہی صلح پر آمادہ ہوتے ہیں۔ تاریخ اسلام کی مشہور ترین صلح حدیبیہ کی مثال کو مدنظر رکھیں تو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں نے بظاہر دب کر صلح کی تھی' حالانکہ قرآن حکیم اسی صلح کو فتح مبین قرار دیتا ہے۔ اس کی توجیہہ دو ہی باتوں سے ہو سکتی ہے: اوّل یہ کہ اپنے آپ کو مضبوط بنانے کے لیے مسلمانوں کو مزید مہلت درکار تھی اور دوم یہ کہ کفار پر اِتمامِ حجت کرنا مقصود تھا کہ صلح نامے کے بندھن کے ذریعے کفار مکہ کی بدعہدی اور ان کے نام نہاد دین و ایمان کی قلعی کھولنا مقصود تھا' وگرنہ دین اسلام تو دوسرے تمام ادیان پر غالب ہونے کے لیے ہی آیا ہے' جیسا کہ متعدد نصوصِ قرآنی سے ثابت ہوتا ہے۔

اس تناظر میں ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ان روایات میں مسلمانوں اور اہل روم کے مابین جس صلح کا ذکر ہے' اس کا تعلق مسلمانوں کے دورِ مغلوبیت سے ہے جب اہلِ روم غالب

ہوں گے اور مسلمانوں کو کسی خاص مصلحت کے تحت اہلِ روم کے ساتھ صلح پر مجبور ہونا پڑے گا' اور یہ مصلحت یقیناً وہی ہے جس کا ذکر روایات میں آیا ہے' یعنی ایک تیسرے دشمن سے محفوظ رہنے کے لیے اہل روم کے تعاون وامداد کی ضرورت۔

یہی معاملہ اہل روم کا ہوگا کہ وہ اپنی بعض مصلحتوں کے تحت مسلمانوں کے ساتھ صلح پر مجبور ہوں گے۔ درحقیقت یہ مسلمانوں کا وہی دَورِ مغلوبیت ہوگا جسے ایک روایت میں غلامی والی ملوکیت کے دَور کا نام دیا گیا ہے کہ جب اُمت مسلمہ اپنے زوال کی انتہائی حد کو پہنچ کر دوسروں کے تعاون وامداد کی محتاج ہو چکی ہوگی۔

(۲) راقم کے خیال میں ان روایات کی مخاطب عمومی طور پر پوری اُمت ہے نہ کہ اس کا کوئی مخصوص گروہ' جیسا کہ بعض حضرات کے خیال میں یہاں مخاطب صرف اہل عرب ہیں اور اسی بنا پر وہ کویت کی آزادی کے لیے ۱۹۹۱ء میں مغربی افواج اور چند عرب ممالک کی طرف سے عراق کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کو اِس کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ راقم کے خیال میں یہ نقطۂ نظر انتہائی کمزور ہے اور بہت سی پیچیدگیوں اور سوالات کو جنم دینے کا باعث بنا ہے۔ صلح کے متعلق پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ دو متحارب فریقوں کے مابین ہوتی ہے۔ اگر یہاں مخاطب صرف اہل عرب ہی ہوں اور اس صلح کا مصداق اہل عرب اور اہل مغرب کا عراق کے خلاف مشترکہ کارروائی کرنا ہی قرار پائے تو کیا اس صلح سے قبل اہل عرب اور اہل صلیب باہم ایک دوسرے کے خلاف مصروفِ پیکار تھے؟ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے' بلکہ وہ تو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون جاری رکھتے ہوئے ایک طرف تو جہاد افغانستان میں سرخ روسی سامراج کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے تھے تو دوسری طرف ایران کے خلاف جنگ میں عراق کی مدد کر رہے تھے۔ مزید برآں روایات میں اس صلح کو ایک تیسرے دشمن سے حفاظت' سلامتی اور مالِ غنیمت کے حصول کا باعث قرار دیا گیا ہے' اور یہ کہ اس صلح کے لیے مذمت یا ناپسندیدگی کا کوئی قرینہ بھی موجود نہیں ہے۔

کیا عربوں اور مغربی اتحادیوں کی عراق کے خلاف جنگ سے مذکورہ بالا فوائد میں سے ایک بھی حاصل ہوا تھا؟ اور کیا عراق (جو خود بھی عرب کا ہی حصہ ہے) چند عرب ممالک کے لیے واقعتاً اتنا بڑا خطرہ تھا کہ اس کی خاطر احکامِ شریعت کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے غیر مسلم افواج کو جزیرۃ العرب کی مقدس سرزمین میں داخلے کی اجازت دے دی جاتی؟ اور یہ

کیسے ممکن ہے کہ اہل عرب کے اس انتہائی خلافِ شریعت اقدام کے متعلق آنحضورﷺ ناپسندیدگی کا ذرا سا اظہار بھی نہ فرماتے جبکہ آپﷺ کا معمول ایسا ہرگز نہیں تھا' جیسا کہ اکثر و بیشتر دیگر روایات سے یہ حقیقت بخوبی معلوم ہوتی ہے۔ پس راقم الحروف کے خیال میں اقرب الی الصواب یہی بات ہے کہ ان روایات کی مخاطب بحیثیت مجموعی اُمت مسلمہ ہی قرار پائے۔

(۳) روایات میں ایک تیسرے فریق کے خلاف جنگ کے لیے تو غزوہ کا لفظ وارد ہوا ہے جبکہ صلح ٹوٹنے کے بعد مسلمانوں اور اہل روم کے مابین ہونے والی جنگوں کے لیے **ملحمة** یا **الملاحم** کے الفاظ استعمال کیے گیے ہیں۔ غزوہ کا مطلب معرکہ یا مہم ہے جس میں جنگ کا ہونا بھی لازم نہیں' جیسا کہ غزوۂ تبوک کے حوالے سے ہم جانتے ہیں کہ اس میں جنگ کی نوبت ہی نہ آئی تھی' جبکہ **ملحمة** کا مطلب گوشت کے چیتھڑے اڑانے والی یعنی بہت زیادہ خونریزی اور ہلاکت و بربادی کا باعث بننے والی جنگ ہے۔ اس فرق کو ملحوظِ خاطر رکھیں تو دورِ حاضر کی دو جنگی اصطلاحات سرد جنگ (Cold War) اور گرم جنگ (Hot War) کو بالترتیب غزوہ اور **ملحمہ** کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے' لہٰذا ان روایات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے غزوہ اور ملحمہ کے فرق کو مدّ نظر رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ اس فرق کو مدّ نظر نہ رکھنے کی وجہ سے ہی بعض حضرات ایک تیسرے فریق کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کو مستقبل کی ایک ہولناک عالمگیر جنگ قرار دیتے ہیں' حالانکہ روایت میں غزوہ کے الفاظ اس کی تائید نہیں کرتے۔

(۴) ان روایات میں جنگ کے بعد رونما ہونے والا واقعہ (یعنی ایک عیسائی کا صلیب بلند کرنا اور اس کے غالب آ جانے کا اعلان کرنا) فی الحقیقت ایک واقعہ ہے یا پھر حقیقت احوال کو سمجھانے کے لیے محض ایک تمثیل؟ راقم نے جہاں تک اس پر غور کیا ہے تو اسے ایک تمثیل قرار دیے بغیر کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا' جس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دَور تو سیکولرازم کا دَور کہلاتا ہے جس میں محض مذہب کے نام پر جنگ کرنا ہی معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ اہل اسلام اور اہلِ مغرب کے مابین جاری موجودہ آویزش اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے تو مذہبی تعصّبات کی بنا پر ہی ہے تاہم اس حقیقت کو کھلے عام تسلیم نہیں کیا جاتا' جس کی ایک وجہ تو راقم کے خیال میں یہ ہے کہ ایسا کرنے سے اہل مغرب کے نام نہاد تصور سیکولرازم کی نفی ہوتی ہے جبکہ دوسری وجہ یہ ہے کہ کھلم کھلا مذہب کا نام استعمال کرنا ان کے مفاد میں بھی نہیں ہے کہ اس کا مطلب تو گویا پورے عالم اسلام کو عیسائی قوتوں کے خلاف متحد ہونے کا موقع فراہم کرنا ہوگا اور عالم اسلام کا متحد ہو جانا ہی ان سازشی اقوام کے لیے پیغامِ شکست سے کم نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کی وحدت کو

پارہ پارہ کرنے کے لیے ہی تو مغربی قوتوں نے ایک طویل عرصہ تک سازشوں کے جال بُن بُن کر بالآخر ۱۹۲۴ء میں وحدتِ اُمت مسلمہ کی علامت یعنی ادارۂ خلافت کا خاتمہ کروادیا تھا۔

موجودہ دَور میں اہل مغرب مسلمانوں کے خلاف مختلف حیلوں بہانوں اور سازشوں کے ذریعے ہی جنگیں مسلط کر رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ سرکاری سطح پر مذاہب کی جنگ تو کجا تہذیبوں کی جنگ (clash of civilizations) کی اصطلاح سے بھی گریز کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کبھی کبھار سچی بات مُنہ سے نکل ہی جایا کرتی ہے‘ جس کی ایک اہم مثال صدر بش کا ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد ’’دہشت گردوں کے خلاف صلیبی جنگوں کے آغاز‘‘ کا اعلان کرنا تھا۔یہ اور بات ہے کہ بعد ازاں سرکاری طور پر اُن کے یہ الفاظ بعض اُن مصلحتوں کی وجہ سے واپس لے لیے گئے تھے جن میں سے بعض کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

راقم کی اس دلیل پر یہ ممکنہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ایسا ہونے (یعنی کھلم کھلا مذہب کا نام استعمال کیے جانے) کا امکان مستقبل میں تو موجود ہے‘ تو اس کے جواب کے لیے اُن روایات پر غور ہی کافی ہوگا جن میں **الملحمة العظمٰی** کے نام سے مسلمانوں اور اہل روم کے مابین ہونے والی عظیم ترین جنگ کی وجہ بھی خالصتاً مذہبی معلوم نہیں ہوتی‘ بلکہ اس کا ظاہری سبب اپنے اُن سپاہیوں کو چھڑوانا ہوگا جو غالباً مشرف بہ اسلام ہو کر مسلمانوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہوں گے‘ جیسا کہ ایک طویل حدیث مبارکہ کے درج ذیل حصہ سے معلوم ہوتا ہے:

> ’’پھر جب وہ (مسلمان) صف بندی کر لیں گے تو رومی ان سے کہیں گے کہ تم ہمارے اور اُن لوگوں کے درمیان سے ہٹ جاؤ جنہوں نے ہمارے لوگ قیدی بنا لیے ہیں۔ (جواباً) مسلمان کہیں گے: اللہ کی قسم‘ ہم تمہارے اور اپنے بھائیوں کے درمیان سے ہرگز نہیں ہٹیں گے۔پھر وہ اُن سے جنگ کریں گے‘‘۔(رواہ مسلم عن ابی ہریرہؓ)

یہاں اہل روم جنگ کا ظاہری سبب محض اپنے بھگوڑے سپاہیوں کو چھڑوانا قرار دیں گے‘ حالانکہ یہ دیگر تمام اسباب میں سے محض ایک سبب ہوگا‘ جبکہ اصل سبب ان کا مسلمانوں اور اسلام کے خلاف مذہبی تعصب وبغض ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر معاشی وسیاسی مفادات کا تحفظ وحصول ہوگا۔جیسا کہ ہم خلیجی جنگ ۱۹۹۱ء‘ افغان جنگ ۲۰۰۱ء اور عراق پر امریکی قبضہ کے لیے ہونے والی جنگ ۲۰۰۳ء اور دیگر جنگوں کے حوالے سے بخوبی جانتے ہیں کہ ان جنگوں کے اسباب محض وہی نہیں تھے جو بیان کیے گئے تھے۔کیا اپنے باغی سپاہیوں کی بازیابی کا مطالبہ

اور انہیں چھڑوانے کے لیے اُن کا جنگ کرنا‘ اہل مغرب کی طرف سے اسامہ بن لادن اور دیگر نام نہاد دہشت گردوں کو اُن کے حوالے کرنے کے مطالبہ سے ملتا جلتا نہیں ہے؟ پس راقم کے خیال میں روایات میں بیان کیا گیا واقعہ ایک تمثیل کے سوا کچھ نہیں جس کا مقصد مسلمانوں اور اہل روم کے مابین ہونے والی عارضی صلح کے ٹوٹ جانے کے عمل کو بیان کرنا ہے۔

اس حقیقت کو ایک اور انداز سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے‘ یہ دور مسلمانوں کی مغلوبیت کا دور ہے اور اس وقت عالم اسلام کے تقریباً تمام حکمرانوں کی حیثیت محض کٹھ پتلیوں سے زیادہ نہیں۔ ان سامراجی غلاموں سے اس بات کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے کہ وہ محض ایک معمولی واقعہ کی بنا پر اپنے بیرونی آقاؤں کے خلاف جنگ کے لیے آمادہ ہو جائیں گے؟ جبکہ یہ حقیقت ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جنگ کی نوبت تب ہی آتی ہے جب دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر جازم ہو کر جنگ کے لیے تُل جائیں۔ ایک فون کال پر یوٹرن لینے والے ان حکمرانوں سے اس بات کی توقع تو بجا طور پر رکھی جا سکتی ہے کہ مذکورہ بالا واقعہ کے ذمہ دار (یعنی صلیب بلند کرنے والے عیسائی سپاہی کو قتل کرنے والے شخص) کا کورٹ مارشل کر دیا جائے یا پھر اسے گوانتانامو بے کے جزیرے میں پہنچا کر صلیبیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے‘ لیکن اس معمولی واقعہ کی بنا پر اپنے آقاؤں کے خلاف جنگ کا تو سوچنا بھی ان کے لیے محال ہو گا۔

مزید برآں ابتدا میں بیان کی گئی دونوں روایات کے باہمی اختلاف سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ دراصل ایک تمثیل ہی ہے۔ ایک روایت میں صلیب بلند کرنے والے عیسائی کی صلیب ٹوٹنے کا بیان ہے تو دوسری میں اس کے قتل کا۔ یہ اختلاف بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا منشاء ایک مسلمان کا ردعمل بیان کرنا تھا نہ کہ ایک حقیقی واقعہ۔ غالباً اسی وجہ سے راویوں کے بیانات میں بھی اختلاف واقع ہوا ہے۔

درج بالا تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ ان روایات کی مخاطب پوری اُمت مسلمہ ہے اور یہ کہ ان میں بیان کیا گیا واقعہ ایک تمثیل ہے جس کا مقصد یہ حقیقت بیان کرنا ہے کہ مسلمانوں اور اہل روم کے مابین ہونے والی صلح اُن کی ایک تیسرے فریق کے خلاف ہونے والی مشترکہ جنگ میں فتح کا کریڈٹ لینے کے چکر میں ٹوٹ جائے گی۔ عیسائی اس فتح کا سبب اپنی صلیب کو قرار دیکر اپنے مذہب‘ تہذیب و تمدن اور سرمایہ دارانہ نظام کے غالب ہونے کا اعلان کریں گے جسے مسلمانوں کا ایک باحمیت طبقہ اسلام کی توہین سمجھتے ہوئے اس کے خلاف اپنے ردعمل کا

اظہار کرے گا۔ یہ ردعمل فطری طور پر جوابی ردعمل کو جنم دے گا جو اہل روم کی طرف سے مسلمانوں پر مختلف حیلوں بہانوں سے جنگیں مسلط کرنے پر منتج ہوگا۔ جیسا کہ بعض دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی چھپ چھپ کر اکٹھے ہوں گے' مسلمانوں کے خلاف سازشیں کریں گے اور دیگر اقوام کو اپنے ساتھ ملا کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں گے اور اب ان کے سامنے مسلمانوں کی حیثیت محض سیلاب کے جھاگ کی سی رہ جائے گی۔

درج بالا بحث کے نتیجہ میں اُن حضرات کا نقطۂ نظر بہت حد تک وزنی اور درست معلوم ہوتا ہے جن کے خیال میں ان روایات کا مصداق افغانستان میں اشترا کی روس کے خلاف لڑی جانے والی جنگ ہے جس میں اہل مغرب نے سوشل ازم کا پھیلاؤ روکنے کی خاطر مجاہدینِ اسلام کی مدد کی تھی۔

مسلمانوں اور اہل روم کے مابین صلح کے عمل کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا آغاز گزشتہ صدی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی ہو گیا تھا جب دورانِ جنگ ہی ۱۹۱۸ء میں سوشلزم کے نظریہ کی بنیاد پر ایک بڑے ملک یعنی روس میں انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ چونکہ یہ انقلاب مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ایک ردعمل تھا اور اس نے مذہب کو بھی افیون کا نام دے دیا تھا لہٰذا سرمایہ دارانہ نظام کی علم بردار عیسائی دنیا نے اسے اپنے لیے ایک بڑا خطرہ قرار دیتے ہوئے اس کے ممکنہ پھیلاؤ کی روک تھام کے لیے اپنے اتحادیوں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اسی مصلحت کے پیش نظر انہوں نے خلافت عثمانیہ کے مقبوضات پر اپنا تسلط زیادہ دیر برقرار رکھنے میں ہی عافیت جانی کہ مذہب کے نام پر سوشلزم کا مقابلہ کرنے کے لیے مذہب اسلام کے پیروکاروں کے علاوہ کوئی اور مضبوط اتحادی انہیں میسر نہ آ سکتا تھا۔

دوسری طرف مسلم دنیا بھی اس انقلاب سے برابر کا خطرہ محسوس کر رہی تھی جس کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ تو سوشلزم کے نظریہ کا خلافِ فطرت اور خلافِ اسلام ہونا تھا جبکہ دوسری وجہ اشترا کی نظام کے سرخیل سوویت یونین کے توسیع پسندانہ عزائم تھے۔ وہ وسطی ایشیا کی اکثر اسلامی ریاستوں کو ہڑپ کر چکا تھا جبکہ بحیرۂ عرب اور بحیرۂ اسود کے گرم پانیوں تک رسائی کی شدید خواہش اس کے اندر مچل رہی تھی' جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ پاکستان' ایران' ترکی اور مشرقِ وسطی کے اکثر ممالک اس کے نشانہ پر تھے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ یہی ممالک آپس میں متحد ہو کر سوشلزم کے خلاف محاذ آرائی میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔

عرب حکمرانوں سے امریکہ و یورپ کے اچھے تعلقات و معاہدات‘ عرب دنیا کو سوشلزم سے محفوظ رکھنے کے لیے اہل مغرب کی ایماء پر ۱۹۴۵ء میں عرب لیگ کا قیام‘ مسلمانانِ ہند کے الگ وطن کے مطالبہ کو تسلیم کرتے ہوئے قیامِ پاکستان کو ممکن بنانا اور اس طرح اس خطہ میں سوشلزم کے ممکنہ اثرات کو روک دینا‘ دیگر مسلم مقبوضات میں اپنے من پسند لوگوں کو بطور حکمران مقرر کر کے انہیں آزادی دے دینا‘ وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خاں کا روس اور امریکہ دونوں کی طرف سے دَورے کی دعوت کے باوجود صرف امریکہ کا دورہ کرنا اور اس طرح پاکستان کا سوشلزم کے مقابلہ میں مغربی ممالک کا ایک اہم ترین حلیف بن جانا‘ پچاس کی دہائی میں پاکستان سمیت دیگر کئی اہم مسلم ممالک کا سیٹو‘ بغداد پیکٹ اور سینٹو کے معاہدوں میں شریک ہونا وغیرہ‘ یہ سب مسلمانوں اور اہل روم کے مابین جاری صلح کے عمل کے ہی مختلف مظاہر و سنگ ہائے میل تھے‘ جن کا اوّلین اور بنیادی مقصد اشتراکیت کے اثرات کو محدود کرنے کی خاطر یورپ اور امریکہ کی روس کے خلاف جاری سرد جنگ میں ہمراہی و اتحادی بننا تھا۔ افغانستان پر روسی قبضہ کے موقع پر ہونے والے جہادِ افغانستان کو ایک تیسرے فریق یعنی روس کے خلاف جاری سرد جنگ کا نقطۂ عروج قرار دیا جا سکتا ہے جس میں مسلمان اور اہل روم اپنے مشترکہ دشمن کو شکست دینے میں بالآخر کامیاب رہے۔

اہل اسلام اور اہل صلیب کی لا مذہب اشتراکی کیمپ کے خلاف اس سرد جنگ کے لیے غزوہ کا لفظ انتہائی مناسب ہے۔ یہ جنگ اگرچہ مسلمانوں اور اہل روم نے اپنے اپنے مفادات کی خاطر لڑی تھی تاہم مسلمانوں کو اس سے بے شمار فوائد حاصل ہوئے جن میں اہل مغرب سے جدید ہتھیاروں اور ٹیکنالوجی کے حصول کے علاوہ بالآخر پسپا ہونے والی روسی افواج کے اسلحہ کا بطور مالِ غنیمت حاصل ہونا وغیرہ سب شمار کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کا عالمِ اسلام کی واحد ایٹمی قوت بن جانا بھی اس اتحادی جنگ کی آڑ میں ہی ممکن ہو سکا تھا۔

روایات میں بلند ٹیلوں والی چراگاہ کا مصداق بلاشبہ سرزمین افغانستان کو قرار دیا جا سکتا ہے جو سوشلزم کے خلاف معرکہ آرائی کا آخری میدان بھی بنی اور یہیں سے اس صلح کے ٹوٹنے کا آغاز بھی ہوا۔ صلح ٹوٹنے کے اس عمل کی ابتدا کے متعلق جو واقعہ روایات میں بیان ہوا ہے‘ اس کے متعلق راقم پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ یہ ایک فرضی واقعہ ہو سکتا ہے‘ تاہم اس کے ایک حقیقی واقعہ ہونے کے امکان کو بھی ردّ نہیں کیا جا سکتا‘ کیونکہ عین ممکن ہے کہ بالکل ایسا ہی یا اس سے

ملتا جلتا واقعہ افغانستان کے کسی ایسے علاقہ میں وقوع پذیر ہوا ہو جہاں مجاہدین کی مدد کے لیے مغربی ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کے اہل کار موجود ہوتے تھے اور یہ کہ اس واقعہ کو بعض مصلحتوں کی وجہ سے ظاہر ہی نہ ہونے دیا گیا ہو۔

راقم کے خیال میں ان روایات میں تمثیلی انداز سے جن حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُن کا تعلق ۱۹۸۸ء میں روسی افواج کے افغانستان سے واپسی سے کچھ پہلے کے حالات سے ہے۔ یہ وہ دور تھا جب روسی افواج کی واپسی ایک نوشتۂ تقدیر نظر آ رہی تھی جس کا مظہر جنیوا مذاکرات کو قرار دیا جا سکتا ہے جو بالآخر جنیوا معاہدہ پر منتج ہوئے تھے۔ یہ صورت حال مجاہدین اور مغربی قوتوں کے لیے نوید فتح بن چکی تھی اور دونوں فریقوں نے اس ممکنہ فتح کا کریڈٹ لینے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ چونکہ اس جنگ میں زیادہ تر جانی و مالی قربانیاں مسلمانوں نے ہی دی تھیں لہٰذا فطری طور پر فتح کا سہرا بھی انہی کے سر سجنا چاہیے تھا' مگر اہل مغرب کے لیے یہ گوارا نہ تھا کہ اس فتح کی نسبت اہل اسلام کی طرف ہو' اس لیے کہ ان کے نزدیک اہل اسلام کی فتح درحقیقت دین اسلام کی فتح کے مترادف ہوتی جو انہیں ہرگز گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے جب انہوں نے ایسا کیا اور افغان مجاہدین کو آپس میں لڑوانے کی سازشیں بھی کیں تو مجاہدین کی طرف سے اس پر ردعمل کا اظہار کیا گیا' جس نے اہل مغرب کے خلاف نفرت کے جذبات اور متعدد پُرتشدد واقعات کو جنم دیا' جن میں سے ایک ۱۹۹۳ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو بم دھماکے سے اڑانے کی کوشش کا واقعہ بھی شامل ہے۔ بوسنیا ہرزگوینا کے معاملہ میں جب اہل مغرب نے جانب داری اور ناانصافی کا مظاہرہ کیا تو مجاہدین اس کو بھی برداشت نہ کر سکے ور بوسنیائی مسلمانوں کی مدد کو جیسے ہو سکا' جا پہنچے۔

اُمت کے لیے مجاہدین کے اس احساس اور اہل مغرب کے خلاف چند واقعات (جو اُن کی غیر منصفانہ پالیسیوں ہی کا ردِّعمل تھے) کو مغربی ممالک نے کمالِ عیاری کے ساتھ بنیاد پرستی' انتہا پسندی اور دہشت گردی وغیرہ کا نام دے دیا اور اس طرح اسلام اور اہل اسلام کو بدنام کرنے اور ٹارگٹ بنانے کا ایک آسان ترین فارمولا ان کے ہاتھ آ گیا جسے انہوں نے بعد ازاں پوری شدت و توانائی کے ساتھ دنیا بھر میں مسلمانوں کے استحصال اور مجاہدین اسلام کی بیخ کنی کے لیے استعمال کیا اور جس کا سلسلہ دن بدن بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

ایک روایت میں **و تکون الملاحم** کے الفاظ سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ صلح کے

خاتمہ پر مسلمانوں اور اہل روم کے مابین متعدد جنگیں ہوں گی' لہٰذا روایات میں رومیوں کی طرف سے اسّی جھنڈے لے کر مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا جو ذکر آیا ہے اُس کا تعلق راقم کے خیال میں سب سے آخری جنگ سے ہے جسے دیگر روایات میں الملحمة العظمیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ غالب امکان ہے کہ یہ جنگ حضرت مہدی کے دورِ خلافت میں ہوگی جب اُمت مسلمہ کافی حد تک متحد ہو چکی ہوگی اور مسلمانوں کی متحدہ افواج کے مقابلہ میں رومی بھی ایک بڑا جنگی اتحاد تشکیل دیں گے اور مسلمانوں کے اتحاد میں دراڑیں ڈالنے کی بھی بھرپور کوشش کریں گے۔ رومیوں کا یہ کہنا کہ ہماری جنگ تو صرف اُن لوگوں سے ہے جنہوں نے ہمارے سپاہیوں کو قیدی بنالیا ہے' دراصل اس اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کی ایک چال ہوگی۔ اُن کی یہ چال معلوم ہوتا ہے کہ کسی حد تک کامیاب رہے گی' کیونکہ روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رومیوں کے مقابلے میں اکٹھے ہونے والے مسلمانوں کے لشکر میں سے ایک تہائی جنگ سے فرار ہو جائیں گے' ایک تہائی شہادت کی موت سے ہمکنار ہوں گے' جبکہ صرف ایک تہائی باقی بچنے والے فتح کا سہرا اپنے سر سجائیں گے۔

پس ثابت ہوا کہ عظیم ترین اور فیصلہ کن جنگ سے پہلے کئی جنگیں ہوں گی' تاہم روایات میں ان جنگوں کی تفاصیل بیان نہیں کی گئی ہیں' بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلق آنحضور ﷺ نے قصداً خاموشی اختیار کی ہے جس میں لازماً کچھ حکمتیں پوشیدہ ہوں گی۔ راقم کے خیال میں ان جنگوں کا نہ صرف آغاز ہو چکا ہے بلکہ ان میں سے اکثر جنگیں وقوع پذیر بھی ہو چکی ہیں۔

۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کو اس سلسلۂ ملاحم کی پہلی جنگ یا آنجہانی صدام حسین کے الفاظ میں اُمّ المحارب کہا جا سکتا ہے جب اہل مغرب نے سازشوں کے جال بچھا کر پہلے عراق کا کویت پر قبضہ کروایا اور بعدازاں یہ قبضہ ختم کروانے کی آڑ میں تاریخ کی شدید ترین بمباری کے ذریعے چند دنوں میں لاکھوں عراقی مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے علاوہ عرب ممالک کے وسائل کا بھرپور استحصال کیا۔ عراق پر مسلط کی جانے والی اس ہولناک اور تباہ کن جنگ کے لیے الملحمة کا لفظ انتہائی موزوں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس جنگ کا افغانستان سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا جہاں صلح ٹوٹ جانے کا واقعہ پیش آیا تھا' تاہم اس حقیقت کو اگر اُمت مسلمہ کی مجموعی صورت حال کے تناظر میں سمجھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سوشلزم کے خلاف سرد جنگ کی آڑ میں مسلمانوں نے اہل مغرب سے کافی مفادات حاصل کر لیے تھے جن میں

سے کچھ کا تذکرہ قبل ازیں کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح عراق نے ایرانی انقلاب کو محدود رکھنے کی خاطر ایران کے خلاف طویل جنگ لڑی جس میں اسے بھرپور امریکی پشت پناہی حاصل رہی اور پاکستان کی طرح عراق نے بھی قابل ذکر فوجی قوت حاصل کر لی تھی۔ اب وہ اہل مغرب کے مفادات بالخصوص ان کے لے پالک اسرائیل کے لیے خطرہ کا باعث بن چکا تھا لہٰذا سب سے پہلے اسی ملک سے نبٹنے کے لیے اس کے گرد سازشوں کا جال بچھایا گیا۔ عراق کے خلاف کارروائی کی ایک اور وجہ اس کا تیل کی دولت سے مالا مال ہونا تھا جو اتحادیوں کے لیے ترجیح‘ ترغیب اور تحریص کا زیادہ بڑا سبب بنا تھا۔

جہاں تک افغانستان کا تعلق ہے تو انہوں نے مجاہدین کو آپس میں لڑوانے پر ہی اکتفا کیا تھا‘ تاہم انہوں نے مجاہدین کو کمزور کرنے کی خاطر پاکستان کے راستے سے آنے والے اسلحہ کی سپلائی کو بند کرنے کے علاوہ ان کے لیے راولپنڈی میں قائم کیے گئے ہتھیاروں کے خفیہ مرکز (اوجڑی کیمپ) کو بھی ۱۹۸۸ء میں تباہ کروا ڈالنا ضروری سمجھا۔ مزید برآں انہوں نے کئی مجاہد رہنماؤں کو بھی شہید کروا ڈالا جن میں سرفہرست عظیم مجاہد رہنما عبداللہ عزام (جنہیں گاڈ فادر آف جہاد کہا جاتا ہے اور جو اسامہ بن لادن وغیرہ اکثر مجاہدین کے استاد) تھے۔ اُنہیں ۱۹۸۹ء میں ان کے دو بیٹوں کے ساتھ پشاور میں شہید کیا گیا تھا۔

ایک اور بات قابل غور ہے کہ روایت میں صلح شکنی کے عمل کو اہل روم کی طرف منسوب کرنے کے علاوہ ان کے اس طرزِ عمل کے متعلق غدر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو خفیہ طور پر عہد شکنی اور امانت میں خیانت کرنے کے لیے زیادہ تر مستعمل ہے۔ خود ہی اہل اسلام سے کیے گئے معاہدوں اور اپنے ہی وضع کردہ اصولوں اور قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اہل مغرب نے اہل اسلام کو ہر ممکن حد تک نقصان پہنچانے کے لیے جو خفیہ حربے استعمال کیے اور اب تک کر رہے ہیں‘ اُن کے لیے غدر کا لفظ بالکل موزوں ہے۔ تاہم ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ کے قرآنی الفاظ کے مصداق ان تمام حربوں اور سازشوں کے باوجود اہل مغرب اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام ہی رہے ہیں اور وہ اِن شاء اللہ کبھی بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکیں گے‘ جس کا ثبوت ان کی اب تک کی ناکامیاں ہیں۔ وہ اب تک اپنے عزائم میں کیونکر ناکام ہیں‘ اس کا اندازہ عراق اور افغانستان کے متعلق ان کی پالیسیوں کی ناکامی سے ہوتا ہے۔ افغانستان میں ان کی مجاہدین کو آپس میں لڑوا کر وہاں اپنی من چاہی حکومت قائم کرنے کی سازشیں رنگ نہ لا سکیں اور بالآخر وہاں طالبان کی اسلامی حکومت کی صورت میں ایک ایسی

حکومت قائم ہوئی جس کا خواب مجاہدین اور دین کا درد رکھنے والے حضرات ایک طویل عرصہ سے دیکھ رہے تھے۔ دوسری طرف مشرقِ وسطیٰ میں صدام حسین ان کے لیے لوہے کا ایسا چنا ثابت ہوا جسے طویل عرصہ تک چبانے کے بعد بالآخر اُ گلنا پڑا۔

اپنی ان تمام سازشوں میں ناکامی کے بعد انہوں نے ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کا ڈرامہ رچایا اور اپنی تمام تر قوت کے بل بوتے پر پہلے افغانستان کی اسلامی حکومت کا خاتمہ کیا اور پھر اپنے پرانے ہدف یعنی معدنی دولت سے مالا مال ملک یعنی عراق پر مختلف حیلوں بہانوں سے حملہ کرتے ہوئے اس پر قبضہ کر کے ہی دم لیا۔ لیکن اُن کا یہ تمام مکر وفریب اب پوری دنیا پر عیاں ہوتا جا رہا ہے۔ ایک اور قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت عیسائی دنیا خود تقسیم ہو چکی ہے جس کی ایک بڑی وجہ پوری دنیا پر غالب رہنے کی امریکی خواہش ہے جسے یورپی ممالک پذیرائی بخشنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آثار وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں اور اہلِ روم کے مابین آخری فیصلہ کن جنگ ارضِ فلسطین وشام میں لڑی جائے گی تو اُس وقت عیسائی دنیا کی قیادت امریکہ کی بجائے پاپائے روم کے پاس ہوگی جو یورپی ممالک کو ایک وحدت میں پرونے اور مسلمانوں کی متحدہ افواج کے مقابلہ میں دنیا بھر کی عیسائی قوتوں کو صلیب کے جھنڈے تلے اکٹھا کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ہم جانتے ہی ہیں کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد وہ ایک نمائندہ قیادت وامامت سے محروم ہونے کی وجہ سے دن بدن پستی کی طرف ہی گرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی تعداد دنیا بھر میں قریباً ڈیڑھ ارب ہے' ان کے پاس وافر قدرتی وسائل ہیں اور انہیں اللہ نے بہترین دماغی صلاحیتوں سے بھی نواز رکھا ہے۔ ان سب کے باوجود یہ اُمت دنیا بھر میں ذلت ومسکنت کا شکار ہے تو اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ یہ وحدت واتحاد سے محروم ہے۔ وحدتِ اُمت کی اصل علامت نظامِ خلافت ہے جو مسلمانوں کا حقیقی ورثہ ہے' لیکن یہ اُمت اپنے اس ورثہ کو دقیانوسیت قرار دے کر اس کی طرف لوٹنے کے لیے اس لیے تیار نہیں کہ ان کا آئیڈیل بھی مغربی جمہوریت اور اس کے اصول بن چکے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُمت ان دنوں اُنہی حالات سے دوچار ہے جن سے قوم بنی اسرائیل حضرات طالوت' داوٗد اور سلیمان علیہم السلام کی خلافت کے زمانہ سے پہلے کے حالات میں مبتلا تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث کی رُو سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ اُمت مسلمہ بھی بنی اسرائیل کے سے حالات سے ہو بہو دوچار ہوگی' لہٰذا اس معاملہ میں ہمیں

تاریخ بنی اسرائیل سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ بنی اسرائیل کے اس دور پر مختصر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ اس دور میں وہ متعدد قبائل میں منتشر تھے اور ایک مرکزی حکومت سے محروم تھے جس کی بنا پر وہ اپنے دشمنوں کے لیے تر نوالہ بنے ہوئے تھے۔ اُس دور کی صورت حال کا بہت خوب نقشہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۲۴۶ و ۲۴۷ میں اس طرح سے کھینچا گیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰی یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَیْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۷﴾﴾

''کیا آپ (ﷺ) نے موسیٰؑ کے بعد (ان کی قوم) بنی اسرائیل کے سرداروں کے معاملہ پر غور نہیں کیا؟ جب انہوں نے اپنے نبی (حضرت سیموئیلؑ) سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجیے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کر سکیں۔ انہوں نے فرمایا: کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ اگر تم پر جنگ فرض کر دی جائے تو تم جنگ پر آمادہ نہ ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں جبکہ (صورت حال یہ ہے کہ) ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور اپنے بیٹوں سے بھی (جدا کر دیا گیا ہے)؟ پس جب اُن پر جنگ فرض کر دی گئی تو وہ منہ پھیر گئے سوائے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے' اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔ اور ان کے نبیؑ نے ان سے کہا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طالوتؑ کو بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ (اس پر) انہوں نے کہا: اُسے ہم پر بادشاہت کا حق کیونکر حاصل ہے جبکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے حقدار ہیں اور اسے تو وافر مال و دولت سے بھی نہیں نوازا گیا ہے! انہوں نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے اُسے تمہارے اوپر (فوقیت دیتے ہوئے) چن لیا ہے اور اسے علم اور جسم میں (تمام لوگوں سے) بڑھایا ہوا ہے' اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی حکومت و بادشاہت عطا کرتا ہے' اور اللہ بڑی وسعت والا' علم والا ہے''۔

ان آیات میں بنی اسرائیل کی جو حالت زار بیان کی گئی ہے‘ بعینہٖ یہی حالت آج اُمتِ مسلمہ کی ہو چکی ہے۔ آیات درج بالا کی رُو سے ہماری زبوں حالی کی بھی دو ہی بڑی وجوہات ہیں:

(۱) اُمت کے اندر مرکزیت یعنی ایک ایسے بااختیار اور نمائندہ ادارہ کی عدم موجودگی جو نہ صرف اُمت کے مفادات کی حفاظت کر سکے بلکہ مسلمانوں کے فریضۂ شہادت علی الناس اور نبی کریمﷺ کے مقصدِ بعثت یعنی غلبۂ دینِ حق کو پورا کر سکے۔ اس نمائندہ ادارہ کی مثالی ترین صورت ادارۂ خلافت ہی قرار دی جا سکتی ہے۔

(۲) بنی اسرائیل کی طرح اُمت مسلمہ کا بھی مال و دولت کی محبت (یعنی معاشی فتنہ) میں گرفتار ہونا۔ اس فتنۂ وَھن میں گرفتار ہونے کی خبر آنحضورﷺ نے بھی ہمیں دے رکھی ہے۔ عدمِ خلافت اور معاشی فتنہ کی وجہ سے طرح طرح کے مسائل سے دوچار یہ اُمت ان وجوہات کو دور کیے بغیر نہ تو ان مسائل کو حل کر سکتی ہے اور نہ ہی موجودہ صلیبی یلغار کے آگے ایک مضبوط بند باندھ سکتی ہے۔ لیکن اُمت کی دینی و دنیاوی قیادتوں کو یہ حقیقت اچھی طرح ازبر کر لینی چاہیے کہ انہیں بالآخر بنی اسرائیل کی طرح اُمت کے وسیع ترین مفاد کی خاطر ایک متفق علیہ رہنما کی قیادت میں متحد ہونا ہی پڑے گا۔ لہٰذا میری تمام دینی و سیاسی رہنماؤں سے دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ جلد از جلد ایک ایسے قائد کی تلاش میں سرگرداں ہو جائیں جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہو اور اُمت کی صحیح سمت میں رہنمائی کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اللہ کی نصرت و رحمت بھی ہمارے شامل حال ہو جائے گی اور ہم موجودہ صلیبی یلغار کو نہ صرف روک دیں گے بلکہ دین اسلام کے عالمی غلبہ کی طرف پیش قدمی بھی شروع کر دیں گے۔ راقم کو یقین ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا اور اہل اسلام و اہل روم کے مابین جاری جنگوں کے سلسلہ کی آخری جنگ یعنی **الملحمة العظمیٰ** اہل اسلام کی پہلی اور آخری فتح ہی نہیں ہو گی بلکہ اس سے پہلے ہی مسلمان کچھ معرکوں میں اہل روم کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کی یہ فتوحات ان کے اتحاد یعنی مرکزیت یا بالفاظِ دیگر قیامِ خلافت کے بعد ہی ممکن ہو سکیں گی‘ اور اُمت مسلمہ کی وحدت اور ان فتوحات کا ردِّعمل ہی ہو گا کہ عیسائی دنیا ان کے مقابلہ میں ایک بار پھر پہلے سے بھی زیادہ جوش و ولولہ کے ساتھ متحد ہو کر یعنی اسّی جھنڈوں کے ساتھ مقابلہ پر آ کھڑی ہو گی۔ اور یہ وہ وقت ہو گا جب اُمت مسلمہ اور عالم عیسائیت کی قیادت ان کے بنیاد پرست طبقات کے پاس آ چکی ہو گی‘ جس کی وجہ یہ ہو گی کہ ان دونوں اُمتوں کے نام نہاد سیکولر یا لبرل کہلائے جانے والے طبقات اپنی منافقانہ و

دوغلی پالیسیوں کی وجہ سے بالآخر شکست کھا جائیں گے اور میدان بنیاد پرست مذہبی طبقات کے لیے خالی ہو جائے گا۔ بنیاد پرست طبقات کا غلبہ دونوں اُمتوں کے اندر مذہبی جوش وخروش کو بڑھا کر اوران کے درمیان ٹکراؤ کی شدت میں اضافہ کر کے تاریخ انسانی کی عظیم ترین جنگ **الملحمة العظمیٰ** کے لیے زمین ہموار کر دے گا' جسے اہل کتاب کی روایات میں ہرمجدون (Armageddon) کی جنگ قرار دیا گیا ہے اور جو خیر اور شر کی قوتوں کے مابین آخری اور فیصلہ کن جنگ ہوگی۔ اہل کتاب عیسائی دنیا خود کو خیر کی علَم بردار قوت کے طور پر منوانے کی سب سے بڑی کوشش کرے گی لیکن اسے حقیقی اہل خیر (اہل اسلام) کے ہاتھوں ایسی ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑے گا کہ آئندہ حکومت وغلبہ کی بُو باس ان کے دماغوں سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے گی۔

جب یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ مستقبل کی اسلامی فتوحات قیامِ خلافت کے بعد ہی شروع ہو سکیں گی تو ہمیں اس متوقع خلافت کے نہ صرف قیام کی بھرپور جدوجہد کرنا ہوگی بلکہ قیامِ خلافت کے طریقۂ کار پر بھی غور کرنا ہوگا۔ ہمارے ہاں ایک عام تصور یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کے دوسرے دورِ خلافت راشدہ (جس کی خبر احادیث میں دی گئی ہے) کا آغاز حضرت مہدی کی خلافت سے ہوگا۔ یہ تصور درست معلوم نہیں ہوتا' اس لیے کہ حضرت مہدی تو اس خلافت کے قیام کے بعد منظر عام پر آئیں گے اور اُن کی حیثیت اپنے پیش رو خلیفہ کے جانشین کی ہوگی' جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایک خلیفہ کے انتقال کے بعد اُمت کی مسیحائی کے لیے خلیفہ مقرر کیا جائے گا۔ خلافت وظہورِ مہدی کے بارے میں آئندہ کسی مضمون میں اظہارِ خیال کیا جائے گا۔

1

عراق ولیلائے عراق

ایک لمحۂ اشک سرزمین ''تَجرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہَار'' کی یاد میں

تحریر: مولانا ابوالکلام آزاد

سرزمین عراق کے بارے میں یہ تحریر گزشتہ صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد کے جنبشِ قلم سے نکل کر ''البلاغ'' کے صفحات پر نقش ہوگئی تھی۔ عراق کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر اسے ہدیۂ قارئین کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

یقولون لیلیٰ بالعراق مریضة فما لک لا تضنی وانت صدیق
شفی الله "مرضی" بالعراق فاننی علی کل مرضی بالعراق شفیق
فان تک لیلیٰ بالعراق مریضة فانی فی بحر الحتوف غریق
اهیم باقطار البلاد وعرضها ومالی الی "لیلی" الغداة طریق

یہ اشعار عہد اُمویہ کے مشہور شاعر قیس عامری کی طرف منسوب ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک دن قیس اپنی شوریدگی میں بے خبر پڑا تھا کہ اس کے کانوں میں کسی کی آواز آئی جو کہہ رہا ہے:

الا ان لیلیٰ بالعراق مریضة وانت خلی البال تلهو وترقد

''لیلیٰ عراق میں بیمار پڑی ہے اور تیرا حال یہ ہے کہ بےفکر و بےخبر کھیل کود میں اپنا وقت کاٹ رہا ہے''۔

فلو کنت یا مجنون تضنی من الهویٰ لبتّ کما بات السلیم المسهد!

''اے مجنون! اگر تو واقعی بیماریٔ محبت کا مریض ہے اور تجھے لیلیٰ کے عشق و شیفتگی کا دعویٰ ہے تو ضروری تھا کہ تیرے محبوب کے دکھ میں پڑنے کے ساتھ ہی تجھ پر بھی دکھ طاری ہو جاتا اور اس کی بےقراری سے زیادہ تجھ میں بےقراری اور بےچینی ہوتی۔ عشق کا دعویٰ اور بےدردوں کی طرح بےفکری، یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوسکتیں''۔

کہتے ہیں کہ یہ سنتے ہی قیس مجنوں پر ایک بجلی سی گر گئی' جوش تأسف میں اس نے گریبان پھاڑ ڈالا' سر اور چہرے پر خاک ملنے لگا' عراق ولیلائے عراق کے سوا اس کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا تھا۔ وہ بے خودانہ اٹھا اور ایک سچے دیوانۂ عشق کی شان سے کوہ و بیابان کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابو عیسیٰ روایت کرتا ہے کہ اُس وقت مندرجہ بالا اشعار اس کی زبان پر تھے جن کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''آہ' کہتے ہیں کہ لیلیٰ عراق میں بیمار پڑ گئی ہے۔ پھر تجھے کیا ہو گیا ہے کہ صحیح وتندرست نظر آتا ہے' حالانکہ اس محبوبہ مریضہ کے عشق کا دعویٰ رکھتا ہے؟

خدا سرزمین عراق کے تمام بیماروں کو شفا دے' کیونکہ جب سے میں نے اپنے بیمارِ عراق کی خبر سنی ہے عراق کے ہر بیمار کے لیے شفیق ہو گیا ہوں۔

اگر واقعی یہ سچ ہے کہ لیلیٰ عراق میں بیمار ہے تو مجھے بیماری کی دعوت نہ دو' میں تو موتوں اور ہلاکتوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہوں۔

میں شہروں میں گشت لگاتا ہوں اور عراق تک پہنچنے کی راہ ڈھونڈتا ہوں' لیکن افسوس کہ لیلیٰ تک پہنچنے کی تمام راہیں بند ہو گئی ہیں!''

(۲)

لیکن اے سرزمین عراق! اے بہشت زارِ دجلہ وفرات! اے مصداق **تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ**! اے مایۂ عشق چہل کرور نفوس ملت! قیس عامری کی لیلیٰ چند دنوں کے لیے تیری آبادیوں میں آ بسی تھی اور اس لیے وہ تجھ تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھا' لیکن آہ' ہمارے لیے تو تیری تمام سرزمین یکسر لیلیٰ زار حسن و جمال ہے' اور تیری کسی ایک عمارت کے اندر ہی نہیں' بلکہ تیری خاک کے ہر ذرے کے اندر ہمارے عشق ماضی کا ایک حجلۂ حسن و جمال آراستہ ہے! قیس عامری کی لیلیٰ اگر بادیۂ نجد کے خیموں سے نکل کر تیری سرزمین میں آ گئی تھی تو ہمارے اقبالِ رفتہ کی بھی ایک لیلیٰ ہے جو ریگ زارِ حجاز سے نکلی' اور صدیوں تک تیری سرزمین اس کے لیے منزلِ عیش ونشاط رہی۔ بابل ونینوا کی وراثت تیری ہی سرزمین میں ہم کو دی گئی تھی۔ کلدان اور مدائن کے مدفون خزانے تو نے ہی ہمارے سپرد کیے تھے۔ ہارون الرشید کی سنہری کشتیاں تیرے ہی دجلہ میں تیرتی تھیں۔ مامون اعظم کا دربارِ عظمت واجلال تیری ہی خاک کا ایک افسانۂ گزشتہ ہے۔ تو ہی ہے کہ تیری زمین کا ایک ایک کھنڈر' تیری خاک کا ایک ایک تودہ' تیری نہروں کی ایک ایک لہر' کاروانِ رفتۂ لیلیٰ کا نقشِ قدم اور کاروبارِ عشق ماضی کا افسانہ سرا ہے۔

اور پھر اے سرزمین لیلیٰ! تیری ہی فضائے محبوب ہے جس کے ہر ذرے سے آج بھی بازگشت ناقۂ لیلیٰ کی صدائیں اٹھ رہی ہیں، اور ہر اُس مجنون کے لیے ملامت ہے جو عشق لیلیٰ کے دعوے کے ساتھ سرزمین لیلیٰ سے تغافل بھی کر رہا ہے، حالانکہ عشق لیلیٰ کا دعویٰ اور مسکن لیلیٰ سے غفلت، یہ دونوں چیزیں ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتیں۔

فلو کنت یا مجنون تضنی من الھویٰ   لبتّ کما بات السلیم المسھد!

پس افسوس ہر اُس دل پر، جس نے ''لیلیٰ'' کی یاد کو ایک لمحہ کے لیے بھی بھلایا۔ اور صد افسوس ہر اُس آنسو پر جو ''لیلیٰ'' کے سوا کسی دوسرے کے لیے بہایا گیا۔

اذا کان ھذا الدمع یجری صبابۃ   علٰی غیر لیلٰی ، فھو دمع مضیع!

(۳)

مندرجہ بالا سطور بے اختیار قلم سے نکل گئیں۔ جبکہ موجودہ واقعات کی تقریب سے ہم نے ارادہ کیا کہ سرزمین عراق و بغداد کے بعض مناظر ''البلاغ'' کے صفحات پر شائع کریں۔ عالمگیر جنگ یورپ کے معرکے کچھ عرصے سے سرزمین ایشیا میں منتقل ہو گئے ہیں۔ ازاں جملہ سرزمین بغداد ہے جہاں مہینوں سے میدانِ اقدام و ادبار گرم ہے اور خصوصیت کے ساتھ قط العمارۃ اور مابین بصرہ و بغداد کے مقامات دنیا کے سامنے آ رہے ہیں۔ چنانچہ اس موقع میں بھی سب سے پہلے العمارہ کی آبادی کا ایک منظر آپ کے سامنے ہے جو دجلہ کے کنارے واقع ہے۔ اور اگر آپ چشم تصور سے کام لیں تو انہی ساحلی عمارتوں کے عقب میں جنگ عراقِ گزشتہ کے بہت سے عبرت انگیز نتائج و حوادث نظر آ سکتے ہیں۔ وَھَمُّوْا بِمَا لَمْ یَنَالُوْا!

یہ مناظر دجلہ کے سلسلے میں پہلا منظر تھا۔ نہر دجلہ کا دوسرا منظر بغدادِ جدید کی وسط آبادی کا ہے، جہاں مغربی و مشرقی آبادی کو ایک نئے پل کے ذریعے ملا دیا گیا ہے اور پل کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کشتیاں بکثرت نظر آ رہی ہیں۔ یہ کشتیاں اب تو زیادہ تر شہر کی اندرونی آمد و رفت کے لیے کام میں لائی جاتی ہیں، لیکن کسی زمانہ میں ہارون الرشید اور مامون اعظم کی سیر و تفریح کا بڑا ذریعہ یہی تھیں۔ وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ

تیسرا مرقع سفارت خانہ برطانیہ کی جدید عمارت اور دجلہ کی قدیم روانی، دونوں کا مشترک منظر ہے۔ دجلہ کی سطح اگرچہ بالکل خاموش اور ساکن ہے حتیٰ کہ ایک ہلکی سی لہر بھی اس پر حرکت کرتی ہوئی نظر نہیں آتی، تاہم اگر آپ سننا چاہیں تو اس کی زبان چپ نہیں ہے۔ آپ کو

معلوم ہے کہ صدائیں صرف لبوں کی حرکت ہی سے نہیں نکلتیں، بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خاموش چہرہ اور ایک غیر متحرک لب ان غوامض واسرار کی شرح وتفصیل کر دیتا ہے جن کے لیے زبان کی حرکت اور حلق کی آواز بالکل گونگی ہوتی ہے۔ خاموش فصاحت نے اکثر گویائی کے دعووں کوشکست دی ہے۔

لسان عیی فی الھویٰ وھو ناطق ودمعی فصیح فی الھویٰ وھو اعجم

نظارۂ دجلہ کی ان تین منزلوں کے بعداب ذراان لوگوں کے حالات پر بھی نظر ڈال لیجیے جن کی یاد دجلہ کی یاداور سرزمین دجلہ سے وابستہ ہے۔ ایک عجیب مخروطی شکل کا گنبد آپ دیکھ رہے ہیں جو کسی ہشت پہلو عمارت کے اوپر سے نمایاں ہے اور عمارت کے ہر طرف پختہ قبریں بنی ہوئی ہیں۔ یہ مشہور زبیدہ خاتون زوجہ ہارون الرشید کا مقبرہ ہے اور دجلہ کے بعد ہی آپ کے سامنے آگیا ہے، تاکہ مکان کے ساتھ اس کے پچھلے مکینوں کو بھی دوگھڑی یاد کرلیں۔

بغداد اور بغداد والوں کو یہیں چھوڑ دیجیے، اور آگے بڑھیے۔ اب آپ گنبدوں اور مناروں کی ایک مؤثر سرزمین کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کی یادوتذکرہ کی تقدیس کو زمانہ کے صدہا تغیرات وحوادث بھی نقصان نہ پہنچا سکے، اور جو سرزمین عراق کا سب سے زیادہ پراثر اور تاریخی حصہ ہے، یہ کربلا کی سرزمین عبرت وبصیرت ہے اور روضۂ حضرت سید الشہداء امام حسینؓ کا درخشاں گنبد اور اس کے سربفلک منارے آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ منارے حق کی طاقت کا اعلان ہیں اور کلمۂ حریت کی فتح اور کلمۂ استبداد کے خسران وخذلان کی شہادت ہیں۔ وہ بتلا رہے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑی طاقت حق کی ہے نہ کہ انسانی تاج وتخت کی، اور خدا کی زمین پر سب سے بڑا فتح مند وہی ہے جس نے سب سے زیادہ مظلومی کے ساتھ اپنا خون بہایا۔ تیرہ سو برس ہوئے کہ اس سرزمین پر دو گروہ باہم معرکہ آراء ہوئے تھے۔ ایک گروہ صرف بہتر بھوکے پیاسے انسانوں کا ضعیف وناتواں مجمع تھا، اور جانوں اور گردنوں کے سوا اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ دوسری طرف دِمشق کا تاج وتخت، حکومت وسلطنت، ساز وسامان، خسروی وملوکی، اور ہزارہا انسانوں کا قاہر وجابر گروہ تھا۔ بظاہر پہلی جماعت نے شکست پائی، کیونکہ قتل کر دی گئی اور اس کے خون سے ساحل فرات کی سرزمین مدتوں تک سرخ رہی، لیکن فی الحقیقت یہ ایک محض عارضی منظر تھا۔ غور کیجیے کہ آخر کی فتح مندی اور عاقبت کار کی کامیابی کس کو ملی؟ ان کو جن کے نام ونشان سے بھی آج تمام سطح ارضی خالی ہے، یا اس کو جس کا گنبد آج تک اپنے بقاءِ ذکر اور کلمۂ باقیہ کے

3

ثبوت میں سر بفلک استادہ ہے؟ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آج تمام شاہانِ بنواُمیہ میں سے کسی ایک شخص کی قبر کا بھی دنیا سراغ نہیں لگا سکتی‘ کیونکہ بنوعباس نے ان کی قبروں کو اکھاڑ اکھاڑ کے مسمار کر دیا اور کوئی اثر دنیا میں باقی نہ رکھا۔ برخلاف اس کے مدفن کربلا کا اثر مجسم اب تک حیّ و قائم موجود ہے‘ اور اگرچہ مخالفین کے دستِ تظلم نے بارہا اس کو بھی مسمار و بے نام ونشاں کرنا چاہا‘ تاہم اس کا نشان کسی طرح مٹ نہ سکا کہ ظلم کا دھبہ کبھی نہیں دھل سکتا۔ پھر کیا بقائے قبور و آثار کے بارے میں بھی زمین قانونِ بقائے اَصلح کی پابند ہے اور اپنی گود میں صرف اسی کے اثر کو باقی رکھنا چاہتی ہے جو اَصلح تھا؟

(۴)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے بہشت ونعائم بہشت کا وعدہ کیا تھا‘ اور باغوں کی سرسبز و شاداب زندگی کی بشارت دی تھی:

﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ﴾

’’جو لوگ ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ اختیار کیے تو ان کو باغوں کی زندگی کی بشارت دے دو‘‘۔

یہ باغ وہ تھے جن کا سب سے زیادہ نمایاں وصف یہ تھا:

﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۵)

’’ان کے تلے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔‘‘

یہی جنت تھی جس کا ایمان والوں سے وعدہ کیا گیا تھا اور جس کا وعدہ گزشتہ صالح قوموں سے بھی کیا گیا تھا:

﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا﴾ (مریم)

’’ہمارے بندوں میں جو متقی ہوگا‘ ہم ایسی ہی جنت کا اسے وارث بنائیں گے۔‘‘

اربابِ ایمان وعمل صالح کے لیے یہ وعدہ آخرت میں پورا ہونے والا ہے‘ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا میں بھی پورا ہو گیا۔ اور جو لوگ خدا کے متقی بندے تھے انہوں نے اپنی آنکھوں سے بہشتی زندگی کی نعمتوں کو دیکھ لیا۔ کرۂ ارضی کی تمام بہشتی سرزمینوں کے وارث ہوئے اور فتح مندی وکامرانی کی سلطانی وکامرانی صرف انہی کے لیے نامزد کی گئی۔ اس بہشتی زندگی میں نہ تو اُن کے لیے غم تھا اور نہ ہی نامرادی‘ نہ مایوسی کو وہاں بار تھا اور نہ ناامیدی کا وہاں نام ونشان۔ وہ جو چاہتے تھے پاتے تھے‘ اور جس نعمت کے لیے اٹھتے تھے وہ خود اُن کے سامنے

جھکنے کے لیے دوڑتی تھی:

﴿جَنّٰتِ عَدۡنِ ۣ الَّتِیۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ وَعۡدُہٗ مَاۡتِیًّا ﴿۶۱﴾ لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَہُمۡ رِزۡقُہُمۡ فِیۡہَا بُکۡرَۃً وَّعَشِیًّا ﴿۶۲﴾﴾ (مریم)

''دائمی عیش و مراد کے باغ جن کا وعدہ خدائے رحمٰن نے اپنے نیک بندوں سے کیا' اور جو اگرچہ ان کے سامنے نہیں ہیں اور نہ ابھی وہ دیکھ سکتے ہیں' مگر اللہ کا وعدہ یقیناً پورا ہو کر رہے گا۔ اس بہشتی زندگی میں سلامتی و کامرانی کے سوا کوئی بے کار و فضول صدا اُن کے کانوں میں نہیں پڑے گی۔ اور اُس میں ان کی رزق صبح و شام ان کے لیے تیار رہے گی (اپنی احتیاج اور رزق کے لیے وہ کبھی دکھ نہ اٹھائیں گے)۔''

اس بہشتی زندگی کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ **تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ**۔ پس آخرت کی جنت اعلیٰ کا پرتو دنیا کی حیاتِ بہشتی میں بھی نظر آ گیا' اور وہ تمام بہشتی سرزمینیں مسلمانوں کو سپرد کر دی گئیں' جن کے تلے پاک و شفاف پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ آہ' سرزمین عراق ہی وہ دنیا کی جنت تھی جو عاقبت کی جنت کا ایک ظل کامل ہے اور جس کے نیچے دجلہ و فرات کی نہریں ہر جگہ اور ہر حصے میں بہہ رہی ہیں! یہی جنت دنیا کے سب سے بڑے تمدنوں اور بڑی سے بڑی قوموں کی وراثت میں آئی۔ بابل و نینوا کے تمدن نے یہیں نشو و نما پایا اور ایرانیوں کا تختِ جلال و عظمت صدیوں تک یہیں حکمرانی کرتا رہا۔ بالآخر وراثت ارضی کی جب آخری بخشش ہوئی تو دنیا کے تمام خزائن و دفائن کے ساتھ **تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ** کی بہشت ارضی بھی مسلمانوں ہی کو سپرد کی گئی: ﴿تِلۡکَ الۡجَنَّۃُ الَّتِیۡ نُوۡرِثُ مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ کَانَ تَقِیًّا ﴿۶۳﴾﴾ (مریم)

دنیا نے انقلابات و تغیرات کے سینکڑوں رنگ بدلے' مسلمانوں نے اپنے اعمالِ صالحہ سے اگر اس بہشت ارضی کا اپنے آپ کو مستحق ثابت کیا تھا تو بداعمالیوں سے اپنی نااہلی کا خود ہی فیصلہ بھی کر دیا۔ ان کے باہمی اختلاف و شقاق کی تلواریں سب سے زیادہ اسی مدینۃ الاسلام میں چمکیں اور مسلمانوں کے ایک گروہ نے ہمیشہ اس بہشت سے دوسرے کو بے دخل کرنا چاہا۔ خدا کی زمین صرف صلحاء کے لیے ہے: ﴿اَنَّ الۡاَرۡضَ یَرِثُہَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾﴾ (الانبیاء) اور اس بنا پر کچھ عجیب نہ تھا اگر اس بہشت ارضی کے بسنے والوں کو حکم الٰہی ملتا جیسا کہ اور بہت سی سرزمینوں میں ملا:

﴿اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ﴾ (البقرۃ:۳۶)
''(اس جنت سے) نکل جاؤ، تم میں ایک دوسرے کا دشمن ہے''۔

لیکن اللہ کا وعدہ سچا ہے اور وہ صرف پورا ہی ہونے کے لیے ہے۔ اس نے ﴿تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ﴾ کی بہشت کی جہاں کہیں بشارت دی ہے، وہاں ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے: ﴿تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا﴾ یعنی اس سرزمین بہشت کے تلے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور اس میں مسلمان ہمیشہ رہیں گے، کبھی اس سے نکالے نہ جائیں گے۔ اس کے وعدے کی سچائی کو دیکھو کہ دنیا میں صدہا انقلابات وتغیرات ہو چکے ہیں، لیکن خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا کے وعدہ کا فرمانِ حق اب تک بدستور نافذ وقائم ہے، اور تیرہ صدیوں کی عظیم الشان مدت کے اندر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا ہے کہ اس وعدہ کی سچائی میں فرق آیا ہو۔ اس وعدۂ الٰہی کی ماضی کو تمام دنیا دیکھ چکی ہے، مگر مستقبل کو دیکھنا ابھی باقی ہے۔ ﴿وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۝۵﴾ (الاسراء)
(انتخاب: گل رحمٰن ہمدرد)

بقیہ: حواشی شریعت کی چار بنیادی اصطلاحات

(٤) الجواب الکافی لابن القیم : ١٠٢ ۔ وتحذیر الساجد للالبانی : ١٤٥ ۔
(٥) رواہ احمد والطبرانی والبغوی فی شرح السنۃ۔
(٦) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب الحراسۃ فی الغزو فی سبیل اللّٰہ۔
(٧) الجواب الکافی لابن القیم الجوزیہ، ص ١١٥ ۔
(٨) سنن النسائی، کتاب مناسك الحج، باب التقاط الحصی۔
(٩) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللّٰہ وَاذۡكُرۡ فِی الۡكِتَابِ مَرۡيَمَ اِذِ انۡتَبَذَتۡ مِنۡ اَهۡلِهَا۔
(١٠) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب الامر بتسویۃ القبور۔
(١١) صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی البیعۃ۔
(١٢) صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور واتخاذ الصور۔
(١٣) صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب قول النبی ﷺ جُعِلَتۡ لِیَ الۡاَرۡضُ مَسۡجِدًا وَطَهُوۡرًا۔
(١٤) اغاثۃ اللهفان لابن القیم، ج١، ص ٢١٤ تا ٢١٧ ۔
(١٥) موطأ امام مالك، کتاب النداء للصلاۃ، باب جامع الصلاۃ۔

❁❁❁

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (48)

سرینام

(SURINAME)

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

سرینام : ایک نظر میں

پورانام: جمہوریہ سرینام
رقبہ: ایک لاکھ 63 ہزار 270 مربع کلومیٹر
آبادی: تقریباً پانچ لاکھ
شرح افزائش: 0.3 فی صد
شرح پیدائش: 18.9 فی ہزار
گنجانی آبادی: 7 افراد فی مربع میل
دارالحکومت: پاراماریبو (دولاکھ سترہ ہزار)
کرنسی: سرینامی ڈالر
زبانیں: ولندیزی، سرینامی، انگریزی، اردو
نسلیں : جزائر شرق الہند کے باشندے جو ترک وطن کر کے یہاں آئے تھے۔ ان کو ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے۔ یورپی، ایشیائی، جاوی، چینی اور یورپی۔
مذہب : ہندو 25 فیصد، مسلمان 20 فیصد، پروٹسٹنٹ 25 فیصد، رومن کیتھولک 22 فیصد،
شرح خواندگی: 95 فیصد

مجموعی قومی پیداوار: 1.53 ارب ڈالر سالانہ
فی کس آمدنی: 3500 ڈالر سالانہ
شرح افزائش: 1.5 فیصد
افراطِ زر: 17 فیصد
بے روزگاری: 17 فیصد
زراعت: چاول، کیلا، ناریل، مونگ پھلی۔
صنعت: باکسائٹ اور سونے کی کان کنی، ایلومینیم کا سامان، لکڑی کا کام، ماہی پروری، خوراک سازی۔
قدرتی وسائل: باکسائٹ، کچا لوہا، عمارتی لکڑی، مچھلی، گھونگھا۔
برآمدات: کل مالیت 495 ملین ڈالر
درآمدات: کل مالیت 604 ملین ڈالر
تجارتی ساتھی: امریکا، ناروے، فرانس، ٹوباگو، آئس لینڈ، کینیڈا۔

یہ عجیب ملک ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آبادی فقط 20 فیصد ہے، اس کے باوجود اسلامی سربراہی کانفرنس کی تنظیم (او آئی سی) کا مستقل رکن ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ ملک جنوبی امریکہ کے شمال مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ اس کے مغرب میں گیانا، مشرق میں فرانسیسی گیانا اور جنوب میں برازیل ہے۔ اس ملک کو سری نیم، سرینام اور سری نام بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا سابقہ نام ''ڈچ گیانا'' تھا۔

سرینام کے قدیم باشندے سری نن انڈین تھے جن کے نام پر اس ملک کا نام رکھا گیا۔ سولھویں صدی تک جنوبی امریکا کے ریڈ انڈین قبائل بھی یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ سترہویں صدی کے اواخر میں شمالی ہندوستان سے کچھ لوگ تجارت کی غرض سے نقل مکانی کر کے یہاں آئے اور یہیں آباد

ہو گئے۔ یہ لوگ اب بھی ہندی (اردو) بولتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ملک میں ''ہندوستانی'' کہلاتے ہیں۔ بعدازاں انگریز، ولندیزی اور ہسپانوی باشندے بھی یہاں رفتہ رفتہ آتے گئے، بالآخر یہ ملک انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ انگریزوں نے 1667ء میں نیوایمسٹرڈم (نیویارک) کے بدلے ولندیزیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس زمانے میں غلاموں کی تجارت عام تھی۔ افریقہ سے غلام خرید کر یہاں لائے جاتے تھے، جن سے قہوے اور گنّے کی کاشت کا کام لیا جاتا۔

1863ء۔ غلامی کے خاتمے کے بعد تمام بیرونی باشندے ملک کے اندرونی علاقوں میں جا کر بستیاں بنا کر رہنے لگے۔

1870ء۔ مزدور اور کارکن جزائر شرق الہند سے درآمد کیے گئے جو اُس وقت انگریزوں کے قبضے میں تھے۔

1948ء۔ اس نوآبادی کو جو ''ڈچ گیانا'' کے نام سے موسوم تھی، نیدرلینڈ مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ دو سال بعد دفاع اور امورِ خارجہ کے سوا دوسرے امور میں خود مختاری دے دی گئی۔ نسلی فسادات، زبردست بے روزگاری اور افراطِ زر کی وجہ سے نیدرلینڈ نے 25 نومبر 1975ء کو اسے مکمل آزادی دے دی۔ اس کا نیا نام ''سری نیم'' رکھا گیا۔

1980ء۔ فوجی انقلاب آیا۔ سِول حکومت ختم کر دی گئی۔

1990ء۔ مسلح افواج کے کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ کرنل بطروسی کے مستعفی ہونے کے بعد، بوش نیگرو گروپ کی گوریلا تنظیم نے مسلح مزاحمت کا آغاز کیا۔

1991ء۔ عام انتخابات ہوئے۔ فوج کے اقتدار میں کمی آ گئی۔

1992ء۔ گوریلا گروپوں اور حکومت کے درمیان امن معاہدہ ہوا۔

1997ء۔ نیدرلینڈ نے اعلان کیا کہ سابق فوجی آمر بطروسی کے خلاف کوکین کے ناجائز کاروبار اور بدعنوانی کے الزامات کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔

1999ء۔ صدر جولیس وجدن بوش کے خلاف احتجاجی تحریک چلی اور ان سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کیا گیا۔ صدر جولیس نے اعلان کیا کہ وہ 2001ء تک عام انتخابات کرا کر سبکدوش ہو جائیں گے۔

2000ء۔ افراطِ زر 70 فی صد تک بڑھ جانے کے باعث عوام کے زبردست احتجاج کی وجہ سے جولیس وجدن بوش کو قبل از وقت انتخابات کروانے پڑے۔ عام انتخابات سابق صدر رونالڈ وینی ٹیسن کی جماعت نے جیت لیے اور وہ صدر بن گئے۔ اب ستمبر 2007ء تک وہی سرینام کے صدر ہیں۔